باب اول

بلند اقبالؒ.....ایک تعارف:

وہ لوگ جو مغربی ممالک میں اردو زبان و ادب کی سمت اختیار پر نظر رکھتے ہیں اور خاص طور پر ادیب فکشن کے نشیب و فراز کی کہانی کو سمجھتے ہیں۔ان کے لیے ڈاکٹر بلند اقبال کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔وہ ایک جواں سال ادیب ہیں مگر ر پروں میں پختگی ،فنی کمال ،موضوعات کی رنگینی اور ان سب کو پیش کرن کا زائد انداز ان کو ایک تربیت یافتہ ،باشعور ادیب ضرور بنیادیت ہے۔بلند اقبال صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں ان کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے اور محنت نے ان کو جو عظمت بخشی ہے وہ آج پوری دنیا میں مشہور و معروف ہے۔

تاریخ پیدائش:

بلند اقبال صاحب سے انٹرویو کے دوان بلند صاحب نے اپنی تاریخ پیدائش کے متعلق کہا:

> ''میں ۷ اپریل ۱۹۶۶ء کو حیدر آباد سندھ کے ایک ایسے
> گھرانے میں پیدا ہوا جو علمی اور فکری اعتبار سے مشمول و
> مالدار منیر معاشی طور پر سے متوسط حیثیت کا حامل تھا۔''[1]

اس سے یہ بات واضع ہے کہ بلند اقبال صاحب کی زندگی میں تعلیم و تربیت معاشی لحاظ سے رکاوٹ کا شکار نہیں رہی یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم رہے۔

والدین:

بلند اقبال کے والد حمایت علی شاعر اردو دنیا کے اہم ترقی پسند شاعر ہیں اور ایک اہم ادبی شخصیت کے طور پر حد و فکر مشہور ہوں۔بلند اقبال صاحب ان کے بارے انٹرویو کے دوران میں یوں گویا ہوئے ہیں:

> ''میرے والد حمایت علی شاعر اردو ادب میں جانی پہچانی
> شخصیت ہیں اور ترقی پسند رجحان پر زیادہ شاعری کی

ہے انہوں نے مجھے بھی ترغیب کی ہے انہوں نے مجھے
بھی ترغیب دی اور یہی وجہ ہے کہ میں میڈیکل ڈاکٹر
ہونے کے باوجود اس ادبی دنیا کی طرف زیادہ مائل
ہوں۔''[۲]

اس کے علاوہ ان کی والدہ کا نام معراج نسیم ہے اور وہ بھی افسانہ نگاری میں بہت زیادہ ممتاز مقام رکھتی ہیں ان کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی رائے کے متعلق راقم الحروف کو ٹیلیفونک انٹرویو کے دوران بتایا:

''میری تحریروں میں میری والدہ کا اثر زیادہ ہے۔ میری
والدہ افسانہ نگاری کی طرف زیادہ شغف رکھتی ہیں اور
ان کا ذوق ادب میں زیادہ تر افسانہ نگاری کی طرف ہے
۔یہی وجہ ہے کہ میں آج اس مقام پر ہوئی۔''[۳]

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بلند اقبال یہ گھریلو تربیت کا بہت زیادہ اثر ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ادبی دنیا کی طرف مائل ہیں۔ والدین کا ادبی ذوق دیکھ کر وہ بھی ادب میں خاصا جہت مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ گھر نے ادبی و شعری ماحول نے غیر شعوری طور پر بچپن سے ہی بلند زا اقبال کو ادب کی راہ میں بنا دیا۔ چنانچہ کم عمری میں ہی ان کا رشتہ اردو کے بڑے فکشن نگاروں سے استوار ہو گیا۔ میڈیکل کی تعلیم کے دوران انہوں نے سعادت حسن منٹو، کرشن چندر ،راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی۔ قراۃ العین حیدر، غلام عباس اور ممتاز مفتی جیسے بڑے افسانہ نگاروں کو پڑھ لیا تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلند اقبال کی تربیت اور خاص طور پر ادبی تربیت میں تو ان کے گھر والوں خصوصاً والدین کا بہت زیادہ عمل دخل ہے۔

ان کے والد کے ادبی شوق اور ان کی والدہ گرامی کے ادبی جذبہ نے بھی ان کو بھی ادب کے رنگ میں رنگ دیا اور وہ ایک کامیاب ادیب کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

تعلیم وتربیت:

تعلیمی نقطہ نظر سے وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ان کے پاس دنیا کے مختلف تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کرنے کی ڈگریاں موجود ہیں وہ خود کہتے ہیں:

''میں نے مین لسن میں ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی سے
گریجویشن کیا۔پوسٹ گریجویشن کی ڈگری نیو یارک
میڈیکل کالج امریکا سے حاصل کی۔مجھے ارگن ہیلتھ
سائنسز یونیورسٹی امریکا سے میکوشپ بھی ملی۔''[۴]

پاکسان سے میڈیکل کی ڈگری مکمل کرنے کے بعد ان کو بہت سارے معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔جو انہوں نے خندہ پیشانی سے سامنا کیا اور خود تھوڑا بہت کام کرتے اس سے نبرد آزما ہوئے۔آپ میں شوق تھا کہ وہ مغربی ممالک سے تعلیم حاصل کریں اور اپنی اس میڈیکل کی ڈگری کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دلوائیں۔اس مقصد کے لیے انہوں نے پوسٹ گریجویشن کی لیکن اس دوران ان کو سخت معاشی بحران سے دوچار ہونا پڑا جو انہوں نے محنت کر کے خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔بلند اقبال نے معاشی بحران سے نبرد آزما ہونے کے لیے خواہ کتنی مشکلات کا سامنا کیا ہو،لیکن بالآخر وہ وقت گزر گیا۔مشرقی ممالک میں دوران طالب علمی کسی بھی طرح کا غیر علمی کام یا جیب خرچ نکالنے کے لیے کوئی کام کرنا خاصا معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن مغرب کے ترقی یافتہ معاشرے میں ایسا کوئی عمل یا رویہ دیکھنے کو نہیں ملتا۔وہاں کے سماج میں تعلیم کے ساتھ ساتھ اضافی طور پر کچھ بڑھانے کی کوشش سبیل بیدار ہو جاتی ہے ۔تو اسے بہت زیادہ خندہ پیشانی سے قبول کر لیا جاتا ہے۔بلند اقبال صاحب بھی انہی رویوں کے مالک ہیں اور انہوں نے اپنا معاشی پریشر ختم کرنے کے لیے اس طرح کی سرگرمیاں خوب نبھائی ہیں اور خود کو اس معاشی بحران کے بھنور سے آزاد بھی کرایا ہے۔کالج جانے سے پہلے پہلے ناظرین تک اخبار پہنچا دینا،ناشتے کا سامان فراہم کر دینا وغیرہ مفید ثابت ہوتا ہے۔وہ خود یوں بیان کرتے ہیں:

''میں نے اپنا معاشی بحران توڑنے کے لیے دن رات
تھکن اور محنت سے کام کیا کالج سے پہلے اور بعد کے
اوقات میں مسلسل کام کاج میں مصروف رہتا تھا اور
معاشی حوالے سے کچھ نہ کچھ کمائی ہو جاتی تھی۔لوگوں کو
صبح سویرے ناشتہ کا سامان لا دیتا، اخبار بانٹنا یہ معمول
کے کام ہوا کرتے تھے اور میں انہیں سر انجام دیتے
ہوئے کسی طرح کی شرم محسوس نہیں کرتا تھا۔یہی وجہ ہے
کہ میں آج اس مقام پر ہوں کہ اللہ رب العزت نے
مجھے اس قدر نوازا ہے کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ اتنے
معاشی ان والد بندہ اتنا مالا مال ہوگا۔''۵

ہم کہ سکتے ہیں کہ محترم بلند اقبال صاحب کو محنت نے ان کو نہ صرف ایک بڑا آدمی بنایا بلکہ انہوں نے باقی طالب علموں اور خاص طور پر غریب طالب علموں کو بھی ترغیب دی ہے کہ وہ اس طرح کر کے گزر بسر کر کے روزی کما سکتے ہیں اور ساتھ ساتھ تعلیم میں بھی خاصا اور نمایاں مقام پیدا کر سکتے ہیں۔جو بعد میں ان کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے اس کے علاوہ انہوں نے قریہ باتیں کرتے ہوئے کہا راقم الحروف کو بتایا کہ:

''میں رات دیر گئے تک محنت کرتا تھا کسی ریسٹوران میں
ڈیوٹی کرنا تھا۔ٹیوشن پڑھاتا تھا اور اس طرح کی بہت
ساری سرگرمیوں میں مصروف رہتا تھا جس سے میری
آمدنی میں کچھ نہ کچھ اضافہ رہتا اور میرا گزر بسر آرام
سے ہو جاتا تھا۔''۶

ملازمت اور پیشہ وارانہ زندگی:

پیشہ وارانہ حیثیت سے بلند اقبال کو دیکھا جائے تو وہ میڈیسن کے ڈاکٹر ہیں یعنی سادہ لفظوں میں طباعت ان کا پیشہ ہے اور وہ ایک طبیب ہیں اور وہ جسمانی مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔ بلند اقبال بہت سارا عرصہ مختلف میڈیکل کالجز میں ڈیوٹی سرانجام دیتے رہے۔ بلند اقبال ۱۹۹۷ء سے ۲۰۰۰ء تک نیویارک میڈیکل کالج سے منسلک رہے۔ بعدازاں امریکن ڈپلومیٹ کی ڈگری لے کر پورٹ لینڈ، اریگن منتقل ہو گئے، یہاں انھوں نے ڈاکٹری میں خصوصی مہارت حاصل کی۔ وہ خود پیشے کے اعتبار سے اپنے پیشے کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''میں پیشے کے حوالے سے ڈاکٹر ہوں چاہے مجھے
> طبیب کہیں یا حکیم بہر حال میں نے میڈیکل کے
> حوالے سے لوگوں کا علاج کرنے کی ڈگری کی ہے اور
> اس میں تھوڑی بہت مہارت حاصل کی ہے۔ اللہ رب
> العزت کے حکم سے لوگوں کا علاج اس نیت سے کرتا
> ہوں کہ اللہ رب العزت ان کو شفا عطا فرمائیں۔ لوگوں
> کا جسمانی علاج کرتا ہوں یعنی جسمانی طور پر بیمار
> مریضوں کے علاج کا ڈاکٹر ہوں۔''[۷]

ان کی باتیں دلچسپ اور مزے دار ہوتی ہیں جب مقالہ نگار نے ان سے انٹرویو لیا تو بہت محفوظ ہوا۔ بہر حال وہ کہ حوالے سے ایک اچھے پیشے سے تعلق رکھتے ہیں اور شاید آج تو جدید دنیا میں ان کا پیشہ اور ان کی ملازمت معاشرتی حوالے سے اول درجے کا پیشہ اور ملازمت ہے۔

ازدواجی زندگی:

بلند اقبال کی شادی ان کے والد کے قریبی دوست کی صاحبزادی شجعیہ محمود سے ہوئی جو خود بھی حیدر آباد

سندھ کی رہنے والی ہیں۔ان کی شادی میں ان کی والدہ کا کردار زیادہ تھا اور شاید والدہ کی پسند کو وہ زیادہ اہمیت دیتے تھے۔وہ انٹرویو کے دوران اپنی بیوی کے متعلق اس طرح بتاتے ہیں:

''میری بیوی نے میری زندگی کو چار چاند لگا دیے ہیں۔
ہر ایک مرحلے پر ایک مقام پر انہوں نے میری مدد کی اور
میرے حوصلے پست نہیں ہونے دیے۔اس کی محبت
نے مجھے اس قابل بنایا ہے کہ میں آج تعارف کے قابل
ہوں اور میری شخصیت میں نکھار اور خوبصورتی میری
بیوی کے دم سے ہے۔میری شخصیت کو نکھارنے میں کا
بہت زیادہ کردار ہے۔اللہ رب العزت ہمارے گھر کو
خوشیو اور برکتوں سے مالا مال کر دے۔''[۸]

وہ اپنی شادی شدہ زندگی سے یعنی ازدواجی زندگی سے بہت زیادہ حد تک مطمئن ہیں اور اللہ رب العزت کے حضور شکر ادا کرتے ہیں کہ انہیں زندگی میں ایک اچھی رفیق حیات میسر ہوئی۔

والدہ کی محبت اور شخصیت پر اثر:

انہوں نے اپنی والدہ سے بہت اثر لیا اور وہ والدہ سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔وہ افسانہ نگار تھیں اور انہوں نے بھی زیادہ کام افسانہ نگاری میں کیا تو یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت کا اثر تھا وہ خود کہتے ہیں:

''میری زندگی کا قیمتی ترین میرے والدین ہیں اور امی
جان تو بہت زیادہ محبت کرنے والی اور شفیق خاتون
تھیں۔وہ میرے لیے قیمتی سرمایہ تھیں ان کی شخصیت
میرے اندر جوں کی توں سمائی ہے۔''[۹]

ہم کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ ان کی والدہ ایک افسانہ نگار بھی تھیں تو اس لیے شاید بلند اقبال سے ان کی ذہنی ہم آہنگی کچھ زیادہ تھی۔ان کی موت سے قبل بلند اقبال کو سے کوئی خاصی دلچسپی نہیں تھی تو بعد میں بہت زیادہ ہوگئی تھی وہ کتابیں پڑھتے ذہن وفکر کی تعمیر کرتے اور ایک خوب صورت مستقبل کا خواب دیکھتے لیکن جب ایک مہلک بیماری میں ان کی والدہ اس دنیا سے چل بسیں تو اچانک ان کے اندر ایک تخلیق کار پیدا ہوگیا۔والدہ سے محبت ان سے لگاؤ اور ان کو کھونے کا جذبہ اس قدر تھا کہ بلند اقبال کی شخصیت فلسفانہ راہوں پر چل نکلی چنانچہ والدہ کی جدائی کے غم کا تجزیہ اپنے فکری شعر کے ابتدائی مراحل کے بارے میں بلند اقبال خود یوں لکھتے ہیں:

> ''۲۰۰۲ء میں شادی کے محض تین یا چار ماہ بعد ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے میری زندگی کے دھارے کو یکسر بدل دیا۔اچانک میری والدہ کی طبیعت خراب ہوگئی اور میں انہیں پاکستان سے امریکا اور کینڈا لے آیا۔مزید تشخیص سے پتہ چلا کہ انہیں جگر کا سرطان ہے۔جو بدقسمتی سے اپنی آخری حالت میں ہے اور یہ بھی کہ ان کی زندگی محض تین یا چار مہینوں کی ہی مہمان ہے۔ان مہینوں میں مجھ سے جو بھی بس میں تھا وہ میں نے کیا مگر بالآخر وہ نومبر کی اکیس تاریخ کو رحلت فرما گئیں۔ والدہ کی طبیعت کی خرابی کے دوران کم وبیش ہر رات میں بے بسی کے آنسو روتا رہا اور میرے اندر ایک کا عمل چلتا رہا۔میں نمازیں پڑھتا تو سجدوں میں خداوند تعالیٰ سے لڑتا تھا اور جب نمازیں نہیں پڑھتا تو اپنے آپ سے لڑتا تھا۔ہر صبح میں

انہیں موت سے اور قریب ہوتے ہوئے اور خود کو زندگی
سے دور جاتے ہوئے دیکھتا تھا۔اس سارے کو میں نے
والدہ کی وفات کے بعد لکھنا شروع کر دیا۔کبھی آزاد
نظموں کی صورت میں تو کبھی مضامین یوں شاید میں
اپنے غموں کا مداوا کر رہا تھا مگر وہ ساری تحریریں محض
جذباتی گفتگو نہیں تھی بلکہ ان میں طور پر میرا رب تک کا
شعور شامل ہو رہا تھا۔ وہ تحریریں کبھی مجھ سے فلسفہ کی
صورت نکلتی تھیں تو کبھی ادب کی صورت۔''[11]

اس حالت پر زیر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے راقم الحروف کو انٹرویو کے دوران بتایا کہ:

''میری ماں جنھوں نے زندگی میں تو میری تعمیر کی ہی تھی
جانے کے بعد بھی میری زندگی کا راستہ متعین کر گئیں
۔وہ جاتے جاتے دھیمے سے ایک بند دریچہ کھول کر چھوڑ
گئی۔وہ دریچہ جو پہلے کسی دھیان میں نہ تھا پر جب کھلا
تو جیسے میرے گیان کا سبب بن گیا۔ میں سماجی ،سیاسی
اور نفسیاتی مسائل کو افسانوی انداز میں لکھنے لگا تھا اور
یوں میرے اندر کی ٹوٹ پھوٹ نے مجھے ایک نئے
راستے پر لا کھڑا کیا۔شاید تخریب میں میری تعمیر کا عنصر تھا
اور اس سارے عمل کے پیچھے میری والدہ سے شدید
رغبت تھی کہ ان کی موت میری اپنی موت کا سبب بن گئی

تھی۔مگر میرا دوسرا جنم میری والدہ کی صورت مجھ میں ہوا

تھا۔چوں کہ وہ ایک بے انتہا محبت کرنے والی ماں کے

علاوہ ایک خوبصورت افسانہ نگار بھی تھیں۔''[11]

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انہیں اپنی والدہ سے بے حد محبت تھی جس کی وجہ سے وہ ادب کی دنیا میں آئے۔

تخلیقی کام اور باقی حالات زندگی:

بلند اقبال کا نام اردو فکشن کی دنیا میں قطعاً ہے اس دعوے کی پشت پر ان کے افسانوں کی اچھی خاصی تعداد ہے جو ہندو پاک کے موقر رسائل وجرائد میں گزشتہ پندرہ برسوں کے درمیان اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔

بلند اقبال کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ان کی زیادہ تر کتابیں فکشن کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔چنانچہ ان کی پہلی کتاب ''فرشتے کے آنسو'' ۲۰۰۷ء میں دنیا کے ادب کراچی سے شائع ہوئی تھی،جس میں تیس افسانے شامل تھے۔بلند اقبال اس کے متعلق خود بیان کرتے ہیں کہ:

''ان افسانوں میں کیا نیا تھا یہ تو خیر تجزیہ نگار ہی بیان کر

سکتے ہیں مگر یہ ضرور تھا کہ ان کہانیوں میں ایک سائنسی

فکر رکھنے والے نئی دنیا کے شخص کے خواب تھے۔اس

میں بوسیدہ سماجی اور مذہبی رسوم ورواج،فرد اور سوسائٹی

کے نفسیاتی مسائل ،اخلاقیات کے مصنوعی سماجی

معیارات اور مشرقی ومغربی تہذیبوں کے ٹکراؤ سے تخلیق

ہونے والے نئے معاشرے کی عمومی شکل پر کچھ جرأت

مندانہ فطری سوالات اٹھائے گئے تھے جو شاید پڑھنے

والے کو متاثر کر کے سوچنے پر آمادہ کر رہے تھے۔''[۱۲]

بلند اقبال کی اس کتاب کی پذیرائی خوب ہوئی۔مختلف ادبی تنظیموں کی طرف سے ایوارڈ دیئے گئے۔اگلے برس یہ کتاب ہندی اور اردو میں جاوید انور صاحب کے توسط سے شائع ہوئی۔اس طرح ہندوستان کے قارئین نے بھی اسے دلچسپی سے پڑھا۔

بلند اقبال کی دو کتابیں ''میری اکیاون کہانیاں'' اور ''سارے ہی محبت نامے مرے'' ۲۰۱۳ء میں بالترتیب عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی اور ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی سے شائع ہوئیں تھیں۔پہلی کتاب بلند اقبال کی بہترین اکیاون کہانیوں کا مجموعہ ہے۔اس کتاب میں ''فرشتے کے آنسو'' کی تمام کہانیاں بھی شامل کر لی گئی ہیں۔جب کہ دوسری کتاب میں مختلف کتابوں پر تبصرے، شخصیات پر لکھے گئے خطوط، تبصرے اور مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

بلند اقبال نے صرف افسانے تخلیق نہیں کیے ہیں بلکہ ان کا رہوار قلم ڈراموں کے میدان میں بھی دوراں رہا ہے۔ بلند اقبال نے تخلیقی ڈراموں پر مشتمل ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا عنوان ہے ''یہی سے اٹھے گا شور محشر'' اور مکالموں کا مجموعہ ''کبھی دامن یزداں چاک'' ابھی منزال اشاعت میں ہے۔ڈرامے کی کتاب کے بارے میں بلند اقبال نے یہ باتیں بتائی ہیں:

> ''اس مجموعے میں شامل ڈرامے مختلف موضوعات کا
> احاطہ کرتے ہیں مثلاً گلوبل ورلڈ کے ارتقائی عمل میں کس
> طرح انسان اپنے نازک رشتے پامال کر رہا ہے اور پھر
> کس طرح قدرت کی بینائی فکر مکافات عمل کی صورت
> ان رشتوں کو استوار کرنے کا اشارہ دیتی ہے۔''[۱۳]

اس کے علاوہ بلند اقبال نے ناول نگاری کے میدان میں بھی اپنے قلم کا جوہر دکھایا۔چنانچہ ان کا ایک ناول ''ٹوٹی ہوئی دیوار'' متنازعہ علمی موضوع کی وجہ سے خاصہ بحث طلب رہا۔اس ناول کا موضوع وطن اور مذہب کے اس

بنیادی تصور پر سوال قائم کرتا ہے کہ آیا یہ تصور تہذیبوں کے ارتقائی عمل کے دوران تربیت پانے والا ایک مصنوعی تصور ہے یا تصور فطری اور اصلی ہے۔ یہ ناول ۲۰۱۶ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔اس طرح ان کا ایک ناول ''کھوئے ہوئے صفحات'' ۲۰۲۱ء میں سانجھ پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا۔

بلند اقبال ۲۰۱۲ء میں ٹی وی میڈیا سے منسلک ہو گئے اور مختلف ادبی، سیاسی، سماجی اور مذہبی موضوعات پر سنجیدہ گفتگو پر مبنی پروگرام ''یاس ورڈ'' کے نام سے پیش کرنے لگے۔ یہ ایک خاص قسم کا تجربہ تھا جس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی۔انھوں نے بعض ایسے موضوعات پر مباحث کا آغاز بھی، پاکستان جیسے روایت پرست معاشرے میں جس کا تصور بھی محال تھا۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے انقلابی دور میں بلند اقبال نے برق رفتار زندگی سے قدم سے قدم ملا کر اردو ادب کو ترقی کی۔نئی بلندیوں پر پہنچانے کا مزید ایک کارنامہ اس طرح سرانجام دیا کہ ٹی وی شو کے ذریعے وہ دنیا کے بہت سارے ممالک شائقین ادب میں اپنی آواز پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے روٹی دی پروگرام مرتب اور نشر کیے ''دانائی کی تلاش میں'' اور ''دی لائبریری ڈاکٹر بلند اقبال'' یہ خالص عملی و ادبی طرز کے ٹی وی شوز تھے۔ان کی مقبولیت کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ان پروگراموں کو کتابی صورت میں مرتب کیا جا رہا ہے۔

بلند اقبال کا ایک اور ٹی۔وی پروگرام بہت مقبول ہوا تھا۔جس کا نام تھا۔''پاس ورڈ'' اس پروگرام کو امریکا اور کینڈا کے علاوہ برصغیر میں بھی خاصی مقبولیت ملی تھی۔ چند برس قبل اس پروگرام کے چیدہ اور اچھوتے موضوعات پر پاکستان کے پروفیسر مبارک علی نے دو کتابیں ''تاریخ کی چھاؤں میں'' اور ''اندازِ بیاں'' کے نام سے مرتب کی تھیں۔

حال کے دنوں میں بلند اقبال نے اپنے والدین کی یاد میں ''معراج نسیم ورچول ہاسپٹل اور حمایت علی شاعر فاؤنڈیشن'' کے نام سے ایک ایسے اسپتال کی بنیاد رکھی ہے جس میں ڈاکٹروں کی ٹیم مخصوص اوقات میں آن لائن مفید مشورے دی رہی ہے۔ یہ سبھی ڈاکٹر اپنے اپنے میدان کے ماہر ہیں۔اسپتال کے قیام کا بنیادی مقصد دور افتادہ مریضوں کا علاج اور انھیں صحت کے متعلق مزید بیدار کرنا ہے۔اس کے تحت خصوصی طور پر پاکستانی عوام اور عمومی

طور پر تمام دنیائے مریضوں کے لیے مفت مشورے کی سہولت سہولیات مہیا کرائی جارہی ہیں جس کی بدولت مریض راہ راست یا پیغام کے ذریعے عالمی سطح کے ماہرین سے استفادہ کررہے ہیں اور اپنی صحت کے تعلق سے مزید باخبر ہو رہے ہیں۔ یقیناً یہ ایک بہترین اور اپنی تو بہت کام ہے۔

مغربی دنیا کے ادیبوں کا یہ عام وطیرہ رہا ہے کہ وہ مختلف شعبہ جات حیات میں نمایاں خدمات سرانجام دینے والوں کا انٹرویو کرتے ہیں۔ مشرقی ملکوں میں بھی اس کا چلن بہت زیادہ ہے لیکن ان کے مقابلے میں مغربی ممالک کہیں زیادہ دلچسپی اور ذوق سے اس کام کو سرانجام دیتے ہیں چنانچہ جن ادیبوں کے بارے میں معلومات ہمیں حاصل ہوئی ہیں ان میں اکثریت ایسے ادیبوں اور دانش وروں کی ہے جنہوں نے مختلف ادیبوں اور اہل دانش سے مکالموں کو کتابی صورت میں یکجا کر دیا ہے۔

خالد سہیل، عاشور کاظمی، نسیم الٰہی زلفی، جاوید دانش اور اشفاق حسین جیسے ادیبوں کی خاص تعداد ہے جنھوں نے انٹرویوز پر مشتمل کتابیں شائع کی ہیں۔ بلند اقبال کا مکالموں پر مشتمل ایک مجموعہ ''کبھی دامن یزداں چاک'' کے عنوان سے اشاعت کی منزل میں ہے۔ یہ دراصل وہ علمی مکالمات ہیں جو انٹرویو کی صورت مختلف ادبی، سیاسی، سماجی اور علمی شخصیات سے کیے گئے ہیں۔ ان انٹرویوز میں اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے کہ ان موضوعات کو موضوع بحث بنایا جائے جن پر عام طور سے پاکستانی معاشرے میں گفتگو نہیں ہو پاتی وہاں کے میڈیا چینل ان مباحث کو اپنے موضوعات نہیں بنا سکتے۔ اس نقطہ نظر سے یہ کتاب خاصی دلچسپ ہوسکتی ہے بلند اقبال خود اس کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''میری اس کتاب کے پیچھے یہی خیال ہے کہ کسی طرح
> ہماری نوجوان نسلیں اپنے روایتی فکری حلقوں سے باہر
> نکلیں اور جدید معاشرتی فکر اور آنے والے سائنسی دور
> سے ہم کنار ہوجائیں۔''[۱۴]

بلند اقبال نے مشرقی و مغربی ممالک کی زندگیوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ان کی جڑیں اگر ایک طرف مشرقی اقدار و روایت میں پیوست ہیں تو دوسری جانب انہوں نے انہوں نے مغرب کی نئی نزدگی کے مسائل اور چیلنج کو بہت خوبی کے ساتھ قبول کیا ہے۔

بلند اقبال کی کہانیاں راست انداز بیان کیی سہارے آگے بڑھتی ہیں اور قاری کے ذہن پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ان کتابوں کی اشاعت سے دنیائے ادب میں بلند اقبال کے ادبی قد و قامت میں اضافہ ہوا ہے اور ایک ادیب کے طور پر ان کی شناخت مستحکم ہوئی ہے۔بلند اقبال کی کہانیاں کسی مخصوص دا کرے کی اسیر نہیں انہوں نے زندگی کے بہت سارے موضوعات سے اپنے افسانوں کی عمارت تعمیر کی ہے۔اختصار نویسی ان کا بنیادی وصف ہے۔فکشن میں اختصار نویسی کا فن مشکل ترین ہوتا ہے۔سعادت حسن منٹو کا کمال یہی تھا کہ وہ مختصر کہانیوں میں زندگی کا زہر اتار دیا کرتے تھے اور بالکل یہی بات بلند اقبال کی کہانیوں پر بھی صادق آتی ہے وہ زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اور اسی طریقے سے زندگی کا فلسفہ براہ راست زندگی سے ہی اخذ کرتے ہیں۔ان کے ہاں اشتراکیت اور جدیدیت سے کوئی انسلاک نہیں بلکہ وہ دونوں فلسفوں کے درمیان سے ایک علیحدہ راستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔جہاں انسان اور انسانیت نوازدی بنیادی اور مرکزی سبق کی حیثیت سے موجود رہتی ہے وہ ہر صورت اپنی کہانیوں میں انسانی زاویوں کو باقی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بلند اقبال کے موضوعات میں ایک ایسی ترقی پسندی پائی جاتی ہے جو انقلاب اور بغاوت سے نہیں بلکہ اس میں جدید علوم کی برکتیں اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ایجادات و اختراعات کی روشنی شامل ہے،وہ انقلابی انداز اختیار نہیں کرتے بلکہ باغیانہ روش سے گزرتے ہوئے اپنے موضوع کو تازہ ترین علمی حوالوں سے کرتے ہیں اس کے ساتھ ہی وہ اپنے موضوعات کے انتخاب میں بھی انفرادیت کی راہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ان کا افسانہ ''کارٹون''محض ایک چھوٹی کہانی نہیں بلکہ امت مسلمہ کے لیے ایک بڑا فکری المیہ ہے اس طرح کی ایک کہانی ''پہلا پیار'' ہے جو بچوں پر جنسی زیادتی جیسے معاشرتی جرم کے پیچھے کے نفسیاتی المیے کو ایک انوکھے زاویے سے سامنے

لانے کی کوشش ہے۔افسانہ ''نہیں''مسلم معاشرہ اور خاص طور پر عورت کی ایسی کہانی ہے جس میں وہ کسی بھی صورت میں اپنے گھر کے اندر سوکن برداشت نہیں کر سکتی۔''سہاگ رات'' ترقی پسندی اور مذہب کے بیچ پھنسے ہوئے ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہے لیکن مذہبی روایات سے اس کا دامن ابھی بھی الجھا ہوا ہے۔اس کہانی کا ایک المیہ پہلو یہ بھی ہے کہ برصغیر میں مذہب چند ظاہری روایات میں محصور ہو کر رہ گیا ہے۔''یہ کیسی بے وفائی'' ہم جنسی کے موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔اردو میں اب یہ موضوع پرانا ہو گیا ہے لیکن جس انداز سے بلند اقبال نے اسے برتا ہے نیز راوی نے جس طرح اس کہانی کو ایک نئے زاویے سے پیش کیا ہے وہ خود کہتے ہیں:

> ''میں نے اپنے افسانوں کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے ان میں بیشتر ایسے تجربے ہیں جو اس سے قبل بہت کم کیے گئے ہیں اور جس سے جدوجہد کرتے ہوئے میں اپنے دور میں انھیں سر کرنے کی تلاش میں سرگرم ہوں۔ان نئے مسائل کا انسلاک ،زمینی ،علاقائی ،سیاسی ،نفسیاتی اور بنی نوع انسان کے شعوری ،لاشعوری اور تحت الشعوری مسائل سے ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے فردیت کے عجیب وغریب الجھتے ہوئے تصورات سے بھی ہے۔''۱۵

بلند اقبال کے ان افسانوں کی تعداد بہت کم ہے جن میں کینڈائن زندگی کے مسائل کو براہ راست موضوع بنا گیا گیا ہو، دیگر افسانہ نگاروں میں یہ ایک عام سی عادت ہے کہ وہ کینڈائن ثقافت اور وہاں کی زندگی کے مسائل سے پردہ اٹھاتے ہیں جبکہ دیگر لکھاریوں کے برعکس بلند اقبال میں یہ رویہ بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شاید ڈاکٹر بلند اقبال کینڈائی معاشرے میں اس قدر رچ نہیں گئے ہیں کہ انہیں اب اس طرز

حیات میں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔

بلند اقبال کے ان افسانوں کی تعداد خاصی ہے جن کے پس منظر میں پاکستانی معاشرہ نظر آتا ہے۔ان میں پاکستانی سماج کے تانے بانے نیز معاشرتی پیچیدگیوں کو ابھارنے کی جدوجہد ملتی ہے۔لیکن یہ جدوجہد ہمیشہ نئی طرز کی حامل ہوتی ہے اور نقطہ نظر بالکل انوکھا اور غور وفکر پر آمادہ کرنے والا ہوتا ہے۔ان کہانیوں کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے اب معلوم ہوتا ہے کہ بلند اقبال جسمانی طور پر تو کینڈائی سرزمین پر بستے ہیں لیکن ان کی کہانیاں ذہنی طور پر انھیں پاکستان میں روکے رکھتی ہیں۔اس کی وجہ ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ بلند اقبال کا وطن عزیز کی بلندی،خوش حالی اور زندگی کے ترقی پسندانہ نقطہ نظر کی اشاعت کے لیے بے چین رہتا ہے۔یہ اضطراب اور بے چینی انھیں پاکستانی معاشرے سے بے نیاز نہیں رکھ پاتی۔

بلند اقبال کو کینڈا کا صحت مند معاشرہ تو متاثر کرتا ہے لیکن پاکستان کی روایت پرستی کی روح کو مضطرب بھی رکھتی ہے۔پاکستان کی بدحالی اور روایت پرستی،سماجی بے ضابطگی پر ان کا قلم بے باک انداز میں رواں رہتا ہے۔اپنے افسانوں میں وہ انھیں موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں اور قاری کے ذہن کو آگہی اور دیدودانش کی ایک نئی دنیا کی طرف لے جاتے ہیں نیز ایک صحت مند معاشرے کا خواب دکھاتے ہیں بلند اقبال صاحب خود اس بارے میں یوں لکھتے ہیں:

> ''میری تحریریں ادبی ہیں اور ان کا مقصد اور صرف
> پاکستانی معاشرے میں موجود روایت پرستی کو دور کرنا ہے
> اور مذہب کو عملی طور پر سامنے لے کر آنا ہے خاص طور پر
> یہاں کے اکثر لوگ ایسی حالت میں پھنسے ہیں کہ وہ
> صرف اور صرف روایت پر جہت پسند کرتے ہیں۔وہ
> بات کرتے ہیں تو صرف اور صرف روایت پر وہ کیام

کرتے ہیں تو صرف اور صرف روایتی ان لوگوں

میں عمل نام کی چیز بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے یہی وجہ ہے کہ

میں نے اس پر قلم تھاما ہے۔''[۱۶]

ڈاکٹر بلند اقبال کی کتابوں میں شامل کہانیاں افسانے ،ڈرامے، مکالمے اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ واقعی ایسے رویوں کی نفی کرتے ہیں جو روایتی یا روایت پر مبنی ہوں وہ پاکستانی معاشرے کو عملی طور پر پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں اور اس میں بہت زیادہ حد تک کامیاب و کامران بھی رہے ہیں۔

بلند اقبال کے افسانوں کو الگ الگ موضوعات کی درجہ بندی میں اسیر کرنے چیلنج بھرا کام ہے۔ان کے افسانوں کی سکنہ بندی تقسیم بظاہر ممکن نظر نہیں آتی اس کے باوجود اگر ان کی درجہ بندی کی جائے تو مندرجہ ذیل عنوانات ہمارے سامنے آتے ہیں۔

ہجرت اور مہاجرین کے مسائل

خواتین کے مسائل

نفسیاتی مسائل

جنسی مسائل

تہذیبی تصادم اور کشمکش

تقسیم پاکستان کے موضوعات

پاکستانی اور بھارتی مقامی سیاست

داخلی زندگی کی پیچیدگیاں

خارجی زندگی کا مطمع نظر

ان سے ہٹ کر بہت سارے اور مسائل جو ہمیں روزمرہ زندگی میں دیکھنے کو ملتے ہیں اس پر بھی بلند اقبال

کہیں کہیں اپنے افسانوں میں بات کرتے نظر آتے ہیں ۔جیسے سیاسی، مذہبی، اقتصادی، معاشی، معاشرتی، نفسیاتی ،اخلاقی اور تہذیبی مسائل وغیرہ پر وہ تقریباً ہر جگہ پر بات کرتے نظر آتے ہیں ۔ان کی تحریریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ پاکستانی معاشرے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور اس معاشرے سے ہر اس برائی قلع قمع کرنے کا خواب دیکھتے ہیں ۔جو اس کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی ہیں ۔ساتھ ساتھ میں وہ اس معاشرے کو ان روایات سے بھی پاک صاف دیکھا چاہتے ہیں جو اس معاشرے کو ان روایت سے بھی پاک صاف دیکھنا چاہتے یں جو اس معاشرے کی بدنامی کا باعث بن رہی ہیں یا اس معاشرے میں بدامنی وتخریب کاری کا باعث بن رہی ہیں۔

بلند اقبال ادب کی دنیا میں ایک کامیاب نام ہے جس کے معاشرے کی اصلاح کے حوالے سے قلم اٹھایا اور اس میں کامیاب بھی رہے۔

حوالہ جات

۱۔ بلند اقبال صاحب سے راقم الحروف کا ٹیلفون پر رابطہ، انٹرویو، مورخہ 25-01-2023

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً

۸۔ ایضاً

۹۔ ایضاً

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ ایضاً

باب دوم

ناول کی تعریف، آغاز اور اردو ادب میں ناول کی روایت

ناول اطالوی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب نیا، انوکھا، عجیب یہ سب سے پہلے چودھویں صدی عیسوی میں سامنے آیا۔ اس کی شکل Novella ہے یہ صنف اردو میں انگریزی کے توسط سے سامنے آئی۔ اٹلی والے نثر اور نظم میں روز مرہ کے معمولی واقعات کو مسلسل اور مربوط انداز میں ''ناویلا'' کے نام سے جانتے تھے کبھی تو ان قصوں کی بنیاد ازمیہ کہانیوں پر رکھی جاتی تھی اور کبھی گھریلو واقعات سے ''ناویلڈ'' کا ڈھانچہ تیار کیا جاتا تھا۔ عام طور پر خانہ بدوش فقیر اور پیشہ ور داستان گوان داستانوں کو محفلوں اور مجلسوں میں سناتے۔ اس طرح سینہ بہ سینہ اور عہد بہ عہد یہ روایت چلتی رہی اور پھر یہی داستانیں دھیرے دھیرے ملک اور قوم کا ادب بننے لگیں۔ ناول کی تعریف سہیل بخاری اپنی کتاب اردو ناول نگاری میں اس طرح کرتے ہیں:

> ''ناول انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ اس سے ایک مخصوص صنعت افسانہ مراد ہوتی ہے۔ جب انگریزی ادب کے زیر اثر یہ صنف ہماری زبان میں منتقل ہوئی تو اس کا نام ناول بھی اس کے ساتھ چلا آیا۔ فن کی رو سے ناول اس نثری قصے کو کہتے ہیں جس میں کسی خاص نقطہ نظر کے تحت زندگی کی حقیقی و واقعی عکاسی کی گئی ہو۔''[1]

حقیقت یہ ہے کہ ناول نثر میں کہانی کی وہ صنف ہے جو عصری زندگی کی سماجی حیثیت، تہذیبی شعور اور عدنی اسباب و عوامل کو تنظیم و تسلسل کے ساتھ فنی اور جمالیاتی طور پر پیش کرتی ہے۔ ناول کے متعلق علی عباس حسینی نے لکھا ہے:

> ''ناول خیالات انسانی کا تجزیہ ہے اور ان کے مظاہر کا ایک ریکارڈ۔''[2]

دنیا کا سب سے پہلا ناول ''ڈان کولکٹر وٹ (Don Quixote) سروانٹس (Covantes) نے لکھا یہ ناول اسپین میں ۱۶۰۵ء میں شائع ہوا تھا۔

سروانٹس نے یہ ناول بظاہر پرانی داستانوں کا مذاق اڑانے کے لیے لکھا تھا لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس

کی یہ تصنیف ایک نئے فن کی بنیاد بن جائے گی۔اس ناول میں اسپین کے معاشرے میں نیا کچھ تھا اور وہ اس حوالے سے جدید کیوں تھا۔سروانٹس نے اس ناول میں زیادہ تر طنزیہ انداز رکھا ہے اور ایک طرح سے اسپین کے معاشرے کا مذاق اڑایا ہے بہر حال اس وقت کی اسپین کی سوسائٹی پر یہ طنز بہترین تھا اور اس کی ضرورت بھی بہت زیادہ تھی۔

سروانٹس کے عہد کا معاشرہ ایک بلدا ہوا معاشرہ تھا۔اس کے زیر اثر سروانٹس نے سماجی بغاوت کی اور ایک بدلے ہوئے سماج کی ترجمانی کی۔سروانٹس کا یہ عنصر شعوری اقدام ایک نئے فن کی بنیاد بن گیا۔سروانٹس کے ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے احسن فاروقی اور نورالحسن ہاشمی نے لکھا ہے:

> ''اس تصنیف میں فن ناول نگاری کے نقوش ہر طرح سے مکمل طور پر نمایاں ہیں۔نہ صرف یہ کہ ناول کی تمام جزئیات اس میں موجود ہیں بلکہ فن ناول نگاری کا وہ خاص طریقہ جو اس کو دیگر اصناف نثر سے ممتاز کرتا ہے اس میں موجود ہے۔''[۳]

ناول سماجی کشمکش اور طبقاتی تقسیم کی حقیقت پسندی کی ساتھ پیش کرتا ہے۔ناول سماجی حقیقت نگاری اور طبقاتی تصادم و آویزش کا بنیادی اور حقیقی معیار اس لیے قرار پایا کہ اس کا تعلق روح فن سے ہے یعنی یہ داخلی اور فنی پیمانہ ہے۔خارجی سطح پہ ناول کے دوسرے فنی اور جمالیاتی تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔جن کے دائرے میں کردار نگاری، واقعہ طرازی اور پلاٹ وغیرہ آتے ہیں۔جن کے اس داخلی اور خارجی ڈھانچے کا تعلق روح اور جسم کے تعلق کی طرح کا سا ہے۔سہیل بخاری نے اس بات پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کے متعلق یوں رائے دی ہے:

> ''ناول میں زندگی کے مرقعے پیش کیے جاتے ہیں حقیقی و واقعی موضوع کے اعتبار سے اس کا میدان عمل بہت وسیع ہے۔اتنا ہی وسیع جتنی خود زندگی انسانوں کے

افعال و اقوال ،خیالات اور جذبات ،کامرانیاں اور

ناکامیاں ،دلچسپیاں اور پریشانیاں اور دقتیں ،حماقتیں

اورنادانیاں یہ سب ناول کے موضوعات ہیں۔''[۴]

ناول کی کہانی عصری زندگی کا جیتا جاگتا نموز ہوتی ہے ۔اس میں نثری قصے کے ذریعے انسانی زندگی کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ناول تنقید حیات کو پیش کرتا ہے،حقیقت یہ ہے کہ ناول نثر میں کہانی کی وہ صنف ہے جو عصری زندگی کی سماجی حیثیت،تہذیبی شعور اور تمدنی اسباب وعوامل کو تنظیم وتسلسل کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

تہذیب وثقافت کا آپس میں گہرا ربط ہے۔یہ غیر محسوس طریقے سے ساتھ ساتھ رواں دواں ہیں۔تہذیب اگر ایک درخت کی مانند ہے تو ثقافت اس درخت کی شاخیں ہیں۔جس پر پھل، پھول لگتے ہیں اور یہی پھل پھول کسی بھی درخت کا حسن ہوتے ہیں اور اس کی اہمیت کو دوچند کرتے ہیں۔

زندگی کی حفاظت کے لیے اختیار کی گئی سرگرمیاں تہذیبی امور میں شامل ہیں۔مثلاً مکان ،لباس ،کھنا اور سواری وغیرہ۔ہمارا رہن سہن اعتقادات،نظریات، مذہب اور عقائد وغیرہ بھی تہذیب کے زمرے میں شامل ہیں۔ تہذیب کسی بھی فرد واحد سے تعلق نہیں رکھتی۔بلکہ یہ افراد کے مجموعی طرز زندگی اور قواعد وضوابط کا نام ہے۔انسان جب ہوش وحواس سنبھالتا ہے تو زندہ رہنے کے لیے کچھ ضروریات کا محتاج ہوتا ہے اور اسے اخلاقی اور مذہبی اقدار پر عمل پیرا ہونا پڑتا ہے۔یہ سب تہذیبی سرگرمیاں ہیں۔

تہذیب ،فرد اور معاشرے کی مشترکہ اقدار وضروریات رسوم و رواج اور جغرافیائی ،مذہبی اور لسانی ضروریات کی تسکین کرتے ہوئے انھیں ایک انفرادی شناخت عطا کرتی ہے۔تہذیب معاشرے کو منظّم کرنے کے لیے ایک لائحہ عمل کا نام ہے جو افراد کی ساری زندگی کی ایک نظام کا پابند کرتی ہے۔

ثقافت عربی زبان کا لفظ ہے،جس کا مطلب کسی کام کو کرنے میں صداقت ومہارت ہے۔لسان العرب میں اس سے مراد ہے:

''علوم وفنون وادبیات پر قدرت اور مہارت، کسی چیز کو
تیزی سے سمجھ بہت اور اس میں مہارت حاصل کرنا،
سیدھا کرنا، گویا یہ لفظ ان چیزوں سے تعلق رکھتا ہے
۔جن کا تعلق ہمارے ذہن سے ہے۔''۵

تہذیب وثقافت کے بارے میں انتظار حسین اس طرح رقمطراز ہیں:

''۔۔۔ظاہر ہے تہذیبی قدر سے کہیں زیادہ وہ اس کے
معاشرتی روپ کو اہمیت دیتے ہیں۔ان کا بیان ہے کہ
کلچرز مینی روشتوں سے بے نیاز نہیں ہوتا۔''۶

یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی تہذیب کے مطالعہ سے معاشرے کے افراد کا جمالیاتی ذوق، تفریحی شوق، فنی مہارت اور طرز حیات، طرز حکومت سے آگاہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ چونکہ تہذیب وثقافت تغیر آشنا ہوتی ہیں بنتی، بگڑتی رہتی ہیں۔اس لیے انسانی تہذیب کے ارتقاء کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ملیحہ عدنان رقم طراز ہیں: :

''تہذیب وثقافت کسی بھی معاشرے کا وہ مخصوص مجموعی
طرز عمل اور طرز حیات ہے جو لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہوتا رہتا
ہے اور معاشرے کے عام افراد کے درمیان رواج پاتا
ہے ااس میں تمام قسم کے انسانی رویے ، اقدار ،
روایات، علوم وفنون اور مادی اشیاء شامل ہیں۔''۷

''تہذیب'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی درخت تراشنا، کاٹنا اور اصلاح کرنا ہے۔فارسی زبان میں اس سے مراد آراستن و پیراستن ہیں۔تہذیب ہمارے عقائد، جذبات وعادات کا مجموعہ ہوتی ہے۔اس بارے میں البیرونی اپنی مشہور کتاب میں اس طرح رقم طراز ہیں:

''خدا کے متعلق ہندوؤں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ واحد ہے۔ غیر فانی ہے نہ اس کا کوئی آغاز ہے نہ انجام۔ وہ مختار مطلق، قادر مطلق، حکیم مطلق ہے، حی اور محی، احکم الحاکمین اور رب ہے۔ وہ اپنی خسروی و سلطانی میں لاثانی ہے۔ نہ وہ کسی سے مشابہ ہے، نہ کوئی اس کے مشابہ ہے۔''[۸]

سجاد باقر رضوی اس طرح رقمطراز ہیں:

''۔۔۔جیسے جیسے معاشرے میں تغیرات آتے ہیں ویسے ویسے ادب میں بھی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ مطلب یہ جکہ معاشرہ ادب کو پیدا کرتا ہے، ادیب معاشرے کو نہیں بناتا۔ ادب ایک سماجی عمل ہے، تمام سماجی اعمال کی طرح اس کا بھی ایک ماضی ہے، ایک حال اور ایک مستقبل ہے۔''[۹]

پروفیسر احتشام نے تہذیب کے حوالے سے لکھا ہے:

''تہذیب ایک ملک کے فنون لطیفہ، ادب، فلسفیانہ خیالات، طرز، معاشرت، مادی ترقی اور زندگی کے متضاد عناصر کو متوازن بنا کر اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی کا ایک خوش گوار احساس پیدا کرنے کے علاوہ کوئی چیز نہیں۔''[۱۰]

کوئی بھی تہذیب دراصل انسان کی ذہنی، سماجی، مادی، اخلاقی، باطنی اور روحانی کیفیات کے اظہار کا نام ہے یا ہم اس طرح کہ سکتے ہیں کہ دراصل تہذیب ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کا ایسا لائحہ عمل ہے یا ایسے قواعد و ضوابط ہیں جو کہ ہماری زندگی کے لیے از بس ضروری ہیں۔اس میں ہماری بنیادی ضروریات زندگی، ہمارا رہن سہن، اعتقادات،نظریات، مذہب اور عقائد شامل ہیں۔

انسان نے رہائش کے لیے پہلے پہل غاروں کا استعمال کیا۔پھر جھونپڑیاں بنا کر رہنے لگا۔پھر مکان بنائے یہ مکان اسبائی بنیادی ضرورت تھے۔پھر جب انہی مکانات کو آراستہ و پیراستہ کیا گیا تو یہ ثقافتی امور میں شامل ہو گیا ۔سواری کے لیے گھوڑا، اونٹ انسانی ضرورت تھی۔تن ڈھانپنے کے لیے لباس تہذیبی ضرورت تھی۔لیکن جب اسی سواری کو آراستہ و پیراستہ کیا گیا۔لباس کے چناؤ میں متنوع اقسام کے نمونہ جات شامل ہوئے۔لباس پر گل بوٹے لگائے گئے۔موسموں کی مناسبت سے انواع اقسام کے لباس پہنے گئے۔تو یہ سب سرگرمیاں ثقافتی امور میں شامل ہوں گی۔

اس طرح موسیقی ،شاعری ،مصوری ،افسانہ نگاری اور ناول نگاری وغیرہ ثقافتی سرگرمیاں ہیں۔انسانی فطرت میں جمال پسندی شامل ہے۔اس کے اظہار کے لیے اختصار کیے گئے طریقے ثقافتی امور میں شامل ہوں گے ۔ثقافت لوگوں میں فن وادب اور خوب صورتی کی نشان دہی کرتی ہے۔ثقافت کے یہ اجزاء ایک ملک یا گروہ کی روح کا اظہار کرتے ہیں اور کسی شخص میں اس کی طاقت اور کردار کا تعین کرتے ہیں۔ثقافت کسی بھی ملک معاشرے کی خوبصورتی میں اضافہ کا ذریعہ ہے۔

ثقافت کا تعلق انسان کے شعور پہلو سے ہے جس میں اخلاقی قوانین، رسوم ورواج اور جمالیاتی اقدار شامل ہیں۔تہذیب اگر پھکا ہے تو ثقافت کی حیثیت مغز کی سی ہے۔ہر ثقافت Liquid شکل میں ہوتی ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ثقافت جب معمولات کا حصہ بن جاتی ہے تو پھر تہذیب کی اشکال اختیار کر لیتی ہے۔ثقافت ہمارے احساسات ونظریات اور خیالات کا رخ متعین کرتی ہے۔ثقافت انسانی جدوجہد کے اس پہلو کا نام ہے جسے وہ مالی

منفعت یا مادی نقطہ نظر سے نہیں کرتا بلکہ اس عمل سے اس کا مقصود روحانی اور ذہنی تسکین ہوتا ہے۔ بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ تہذیب وثقافت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ غیر محسوس طریقے سے مربوط ومنسلک ہوتے ہیں۔

ثقافت ایک اہم جز وفنون لطیفہ ہے۔فن کسی بھی سماج کی خوبصورت تصویر کشی کرتا ہے۔تہذیبی وثقافتی زندگی کی خوبصورت تصویر ہمیں مختلف فنون میں دکھائی دیتی ہیں۔فن کے اظہار کی مختلف صورتیں مصوری ،سنگ تراشی اور ادب وغیرہ ہیں۔فن کار اپنے فکر وخیال ،احساسات ،جذبات ،مشاہدے اور تجربات کو اپنے فن پارے میں منکس کرتا ہے۔فن کی تحریری شکل ادب ہے۔ادب جذبہ واحساس،علم وخیال کا مجموعہ اور انسانی سماج کا دماغ ہے۔ادب کسی بھی دور کی جیتی جاگتی تصویر کی نشاندہی کرتا ہے۔مختلف ادوار کی تہذیبوں کا عکس ہمیں ادب میں واضح دکھائی دیتا ہے۔اس بارے میں سید ضمیر جعفری رقم طراز ہیں :

> ''تہذیب کمہار کے آوے کی طرح انسانیت پر جو رنگ
> چڑھاتی ہے، پختہ چڑھاتی ہے۔تہذیب کا تعلق معروضی
> عقائد اور سنجیدہ ذہنی اقدار سے ہے۔تہذیب ظاہر میں
> نہیں باطن میں تبدیلیاں لاتی ہے۔اس لیے تہذیب کا
> درس نامعتبر نہیں ۔تہذیب ریا کار نہیں ، زمانہ ساز
> ہے۔''[11]

ادب کی جڑیں ہم زمانہ قدیم کے انسان میں تلاش کریں تو اس کا اظہار زبانی قصہ گوئی سے لے کر داستانوں اور پھر موجودہ دور میں ناول کی شکل میں موجود ہے۔ڈاکٹر صلاح الدین اپنی کتاب ''دلی والے'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> ''اردو زبان وادب کو تہذیبوں کا سنگم کہا جاتا ہے۔یہی
> بات دہلی کی تہذیب وثقافت کے لیے بھی کہی جا سکتی

ہے اور یہاں کے رہنے والوں کے لیے بھی ان دو
تہذیبوں کو پروفیسر محمد حسن کے الفاظ میں '' ہندوستانی
اور ترک ایرانی تہذیبیں کہنا زیادہ درست ہوگا۔''[۱۲]

ہر دور اپنے عہد کی ترجمانی کرتا ہے۔داستان میں عموماً شہزادہ ہیرو ہوتا ہے اور شہزادی ہیروئن،شہزادی کی بازیابی کے عموماً شہزادہ کسی دیو یا جن کے ساتھ جنگ کرتا ہے اور شہزادی کو حاصل کر لیتا ہے۔مندرجہ بالا ادب اس دور کے جاگیردارانہ پس منظر کی نشاندہی کرتا ہے کہ حکمران وہی ہوگا جو کہ فاتح ہوگا۔اس دور کا عہد سماجی کشمکش کے جدید تقاضوں سے واقف نہیں تھا،زندگی سست تھی اور زاویہ نگاہ محدود تھا۔سامراجی نظام کی ابتداء کے ساتھ ہی سماجی کشمکش کی ابتداء ہوئی۔اس سماجی کشمکش کا اظہار ناول میں کیا گیا اس لیے کہا جاتا ہے کہ ہر زبان کا اہم ناول اپنے عہد کی سماجی اور طبقاتی کشمکش کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ناز قادری رقم طراز ہیں:

''اسی عہد میں ہندوستان میں ایک نیا سماج اور ایک نیا
معاشرہ بھی جنم لے رہا تھا۔جاگیردارانہ تہذیب زوال
آمادہ ہو چکی تھی اور اس کی جگہ سرمایہ دارانہ تہذیب و
معاشرہ لے رہا تھا۔یہ دراصل ایک تہذیبی موڑ تھا۔جس
سے راہیں نئی سمتوں میں پھوٹنے لگی تھیں چنانچہ نئے
سماج اور معاشرے کی ترجمانی وتنقید کے لیے ایک نئی
افسانوی صفت ادب کو سامنے آنا تھا۔یہ خوش نصیبی کی
بات تھی کہ اردو والوں کے سامنے انگریزی میں ناول کی
صنف موجود تھی۔جس کو نمونہ بنا کر اردو میں کہانی کے
لیے ناول کی صنف کو ذریعہ اظہار بنایا گیا۔''[۱۳]

ناول معاشرے کی تہذیبی وثقافتی عکاسی کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ تہذیبی وثقافتی زندگی کی تصویر کھینچ کر انھیں الفاظ کا روپ پہنا کر قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ تہذیب وثقافت کے پوشیدہ پہلوؤں ہے۔ پردہ اٹھاتا ہے اعلیٰ ناول نگار زندگی کا گہرا مطالعہ کرتا ہے اور ناول کے ذریعے زندگی کے ہر پہلو سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ناول تہذیب، اخلاق، سماج، فلسفہ اور سیاست کو باہم ملا کر ساتھ لے کر چلتا ہے۔ صالحہ زریں کے خیال میں:

> ''کسی ملک میں رہنے والوں کی تہذیب کی روح ناول میں پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہے۔ سماجی اور سیاسی تبدیلی، برادری اور خاندان کے تصور میں کیا انقلاب ہوا۔ ساتھ ہی اس کے دل و دماغ میں کیا تبدیلی آرہی ہے۔ عقائد کس طرح شکست کھا رہے ہیں۔ سیکولر خیالات کس طرح جنم لے رہے ہیں اور شخصیت کس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہے۔ نفسیات، سماجیات، سائنسی طریقہ کار نے تہذیب پر اپنا اثر کس طرح ڈالا ہے۔ یہ سب چیزیں ہمیں ناول میں صاف نظر آتی ہیں۔''[۱۴]

ناول تہذیب وثقافت کی وہ جھلکیاں دکھاتے ہیں۔ جو عموماً تاریخ میں نہیں ملتیں۔ عہد بہ عہد تہذیب و ثقافت میں ہونے والی تبدیلیوں کا عکس ناول ہی ہمیں دکھاتا ہے۔ لوگوں کی سوچ ان کا رویہ میل جول، رہن سہن، عقائد ونظریات مذہبی میلانات، رسوم ورواج اظہار غم وخوشی کے طریقہ کھانے پینے اور اظہار رائے کے طریقے کیا تھے۔ اس کا عکس ہمیں ناولوں میں ملت ہے۔ جنگ آزادی سے قبل کے ہندوستانی معاشرے کی سماجی اور تہذیبی

مسائل کا عکس ہو یا جنگ کے بعد کا انسانی المیہ ہو برطانوی سامراج کے زیر اثر برصغیر میں ہونے والی تبدیلیاں ہوں یا اپنی معاشرت سے بڑے ہوئے لوگوں کے جذباتی کیفیت کا اظہار ہو دہلی اور لکھنو کی تہذیبی زندگی کے عروج و زوال کی کہانی ہو یا تقسیم ہند کے بعد انسانی قدروں کی شکست و ریخت کی منظر کشی ہو۔ مذہب کے نام پر اپنی دکانیں کھولنے والوں کا تذکرہ ہو یا اشتراکی نظریات کا سہارا لے کر زندگی کی جدو جہد کی تصویر کشی ہو ان سب کا عکس ہمیں ناولوں میں بخوبی دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے اس بارے میں یوں لکھا ہے:

> ''کسی بھی معاشرے، ملک یا قوم کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی تصویر کشی جس حد تک ناول کے ذریعے ممکن ہے۔ شاید کسی دوسری صنف کے ذریعے ناول معاشرہ، فرد اور ذات کے نہ صرف خارجی عوامل و عناصر کو پیش کرتا ہے بلکہ داخلی تضاد و تصادم اور اس کے محرکات کو بھی اپنی گرفت میں لیتا ہے۔''[۱۵]

ناول ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں کسی بھی عہد کی عکاسی اس عہد کے تاریخی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی حوالے سے کی جاسکتی ہے۔ کیوں کہ ادب وہی اہم ہوتا ہے جو اپنے عہد کا آئینہ ہو۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں صنعتی ترقی کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں روسی انقلاب سے مارکزم کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جس کے اثرات ہندوستان میں واضح محسوس کیے جاتے ہیں۔ برطانوی سامراج کے زیر اثر ہندوستان میں تہذیبی .....، کشمکش، سماجی استحصال، جنسی گھٹن، احساس غلامی اور مغربی تعلیم کے اثرات اس دور میں لکھے گئے ناولوں میں بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد جہاں اردو ناول نگاری میں زبردست تیزی آئی وہاں موضوعات بھی تبدیل ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد سماجی، معاشی، سیاسی اور تہذیبی و ثقافتی سطح پر تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان تبدیلیوں کا اثر اردو ناول

نگاری پر بھی ہوا۔

اب تھوڑا سا تعارف اردو ادب میں ناول نگاری کی روایت کے حوالے سے بھی شامل کرتے ہیں کہ اردو ادب میں ناول کا مقام و مرتبہ کیا رہا اور یہ کس طرح وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہا یا اس میں زمانے کے ساتھ ساتھ کیا کیا تبدیلیاں آتی رہیں۔ ذیل کی سطور میں ہم اردو کے ان چند نمائندہ ناول نگاروں کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جن کے ناولوں میں برصغیر کی تاریخ و تہذیب کی پیشکش عمدگی سے ہوئی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد اردو کا پہلا ناول نگار ہے ۔ان کے ناولوں کے نام ''مراۃ العروین''، ''بنات النش''، ''توبتہ النصوح''، ''ابن الوقت''، ''رویائے صادقہ'' اور ''ایامی'' ہیں۔ یہ ناول اس وقت لکھے گئے جب ہماری زوال پذیر تہذیب غیروں کے ہاتھوں میں مٹتی چلی جا رہی تھی۔ نذیر احمد نے شعوری طور پر اپنی تہذیبی زندگی کی حفاظت کے لیے یہ ناول لکھے۔ ان ناولوں میں اہم ناول ''ابن الوقت'' ہے۔ جس میں مشرقی اور مغربی تہذیبی تصادم کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس ناول کا موضوع مذہب، سیاست اور قومی تہذیب ہے۔

انگریزوں کی برصغیر کی آمد کے بعد یہاں کی تہذیبی و ثقافتی زندگی پر یہ جو اثرات مرتب ہوئے ان کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ اس وقت معاشرے میں دو مختلف فکر میں کام کر رہی تھیں۔ پہلی فکر والے لوگ اپنی تہذیب و ثقافت کو چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ ان کے نزدیک نئی تہذیب ان کے لیے اخلاقی و مذہبی تباہی کا سامان لے کر آئی ہے۔ جب کہ دوسری فکر کے لوگ حالات کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو تبدیل کر رہے تھے۔ ابن الوقت بھی اس نئی تہذیب کا علمبردار بن کر سامنے آتا ہے۔ انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے آپ کو بالکل نئے تہذیبی ڈھانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ اس ناول میں مشرقی اور مغربی تہذیبی ٹکراؤ اور کھنچا تانی کی مکمل اور جامع تصویر پیش کی گئی ہے۔ مولوی نذیر احمد کے ہاں ہمیں ایسے معاشرے کی تصویر ملتی ہے۔ جو ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے مگر وہ اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نذیر احمد کے ناولوں میں تہذیبی حوالے سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف سرمست یوں رقم طراز ہیں:

''نذیر احمد نے انگریزوں نے جو قدیم نظام ختم کر کے
جدید نظام قائم کیا اور اس کی وجہ سے ہندوستان میں جو
معاشی ابتری آئی اس کا بڑا ہی تفصیلی اور بصیرت افروز
جائزہ لیا ہے۔اس ناول (ابن الوقت) کی سب سے
بڑی خصوصیت یہی ہے کہ انھوں نے مختلف مسائل کو
جن میں انگریزی اقتدار، معاشی حالات، مغربی تمدن کی
تقلید، انگریزی حکومت کے روشن پہلو شامل ہیں۔ بڑی
ہی عمدگی سے بیان کر دیا ہے۔''[۱۶]

مولوی نذیر احمد کے معاصرین میں ایک اہم نام رتن ناتھ سرشار کا ہے۔ان کا طویل ناول ''فسانہ آزاد'' ہے ۔جو کہ داستان کے قریب ہے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے متعدد ناول لکھے جن میں ''کرھم دھم''، ''کافی''، ''رنگے سیاہ''، ''طوفان بدتمیزی''، ''سیر کسار''، ''جام سرشار'' اور ''بچھڑی دلہن'' وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔لیکن ان سب ناولوں میں سے ''فسانہ آزاد'' سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہوا۔

سرشار نے لکھنو کی معاشرت کے ہر طبقے کی زبان میں لکھنوی معاشرے کی مکمل تصویر تیار کر دی ہے۔لکھنوی تہذیب و تمدن کے آخری زمانے کا مکمل نقشہ ''خانہ آزاد'' میں محفوظ ہے۔لکھنوی معاشرہ جو فارغ البالی کا مظہر تھا اور جس تہذیب کا پروردہ تک سرشار نے اس کی بہترین عکاسی کی ہے۔انھوں نے اردو اخبار کے لیے مضامین کے ذریعے وہ ہر روز لکھنوی تہذیب و معاشرت کے کسی نہ کسی پہلو کی تصویر کھینچتے تھے۔

''فسانہ آزاد'' میں لکھنوی تہذیب و ثقافت کی پیش کش کچھ اس طرح ہوئی ہے کہ وہ تہذیب زندہ صورت میں ہمارے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔مسرت نے اس تہذیب کے گوشے گوشے میں جھانک کر اس کی ہر چھپی چیز کو

باہر نکالا ہے۔

مرزا یاری رسوا کے ناول ''امراؤ جان ادا'' کو اردو کا پہلا مکمل ناول کہا جاتا ہے۔ یہ ناول ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا۔ ان کی دیگر ناولوں میں ''افشائے راز''، ''اختری بیگم''، ''ذات شریف'' اور ''شریف زادہ'' شامل ہیں۔ ''امراؤ جان ادا'' میں جاگیردارانہ سماج کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس ناول میں انیسویں صدی کے لکھنو کے سماجی، ثقافتی اور اخلاقی منظرنامے کو نہایت خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ بظاہر تو یہ ایک طوائف کی کہانی ہے۔ لیکن اس ناول نے اس عہد کی پوری تصویر کھینچ کر ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس تصویر میں اس عہد کی معاشرت، اقدار، ترجیحات اور اخلاقیات کے رنگ ہیں۔ اس دور کے نوابوں، جاگیرداروں اور وڈیروں کی عیاشیوں کی بھلکیاں بھی موجود ہیں۔ دراصل اس ناول میں اس عہد کے زوال پذیر تہذیبی صورت کا المیہ بیان کیا گیا ہے۔ جہاں ایک طرف طوائف نوابوں، جاگیرداروں اور زہد و تقویٰ کے پاسبانوں کو اپنے دام زلف میں گرفتار کرتی ہے تو دوسری طرف اسی طوائف کا کوٹھا تہذیب کی علامت تھا۔ جہاں رؤسا و شرفا اپنے بچوں کو تہذیب و اطوار سکھانے کے لیے بھیجا کرتے تھے۔

مرزا ہادی رسوا کی شخصیت جدید علوم و فنون سے پوری طرح آراستہ تھی۔ انھوں نے اردو ناول نگاری کی روایت کو نئے امکانات سے روشناس کرایا۔ ناقدین نے اعتراف کیا کہ ''امراؤ جان ادا'' ناول کے فن کا مکمل اور خوبصورت نمونہ اور مٹی ہوئی معاشرت کی مکمل تصویر ہے۔

پریم چند اردو کا مشہور ناول نگار اور افسانہ نگار ہے۔ ان کا اصل نام دھن پت رائے ہے لیکن ادبی دنیا میں پریم چند کے نام سے مشہور ہیں۔ ضلع وارانسی مرٹھو کے گاؤں لمہی میں ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوئے۔ ''گئو دان'' پریم چند کا اہم ناول ہے۔ ''گئو دان'' کے علاوہ انھوں نے اور بھی متعدد ناول لکھے جن میں ''اسرار معابدہ''، ''ہم خرما و ہم ثواب''، ''جلوہ ایثار''، ''بیوہ''، ''بازارِ حسن''، ''گوشہ عاضیت''، ''نرملا''، ''غبن''، ''چوگان ہستی''، ''پردہ مجاز''، ''میدانِ عمل'' اور ''منگل سوتر'' شامل ہیں۔

ناول ''گئو دان'' میں اس عہد کی تہذیبی زندگی کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ جاگیردارانہ نظام اور اس کے زیر

اثر مجبور و کسانوں کی حالت زار کا خوبصورت نقشہ کھینچا گیا ہے۔ یہ دور سیاسی ابتری کا دور تھا۔ حکومتی پالیسیوں کے ساتھ ساتھ جاگیرداروں کے ظلم و استحصال نے غریب مزدور اور کسانوں کی زندگی اجیرن بنیادی تھی۔ جہاں غریب دو وقت کی روٹی کے لیے ترس رہا تھا۔ وہاں صنعت کار اور جاگیردار طبقہ مزدوروں، کسانوں کی محنت کے بل پر عیش و عشرت کی زندگی گزار رہا تھا۔ زمیندار، مہاجن اور ساہوکاروں نے غریب کسانوں کی زمینیں ہتھیانے کے لیے سود کا چکر چلا رکھا تھا۔ اس کے علاوہ ناول میں ابھرتے ہوئے سرمایہ دارانہ طبقے کی عکاسی بھی کی گئی ہے کہ اس طبقے کے زیر اثر کس طرح انسان مشینی ماحول میں مشین کا ایک پرزہ بنکر کل سے بچھڑ جاتا ہے اور ذہنی، جذباتی، اخلاقی اور سماجی نے حسی احمد تنہای ء کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ ناول اس وقت تخلیق کیا گیا جب علوم و فنون، تہذیب و معاشرت اور اخلاق و کردار کے حوالے سے ایک نیا زمانہ کروٹ لے رہا تھا۔ اس ناول میں جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارنہ معاشرے کا بھیانک روپ اور اس وجہ سے تہذیبی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

سجاد ظہیر نومبر ۱۹۰۵ء کو ریاست ''اودھ'' کے چیف جسٹس سر وزیر خان نے گھر پیدا ہوئے۔ اکسفورڈ یونیورسٹی (لندن) سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے ۱۹۳۵ء کو لندن میں ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم کی۔ ۱۹۳۶ء میں انھوں نے برصغیر میں ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کی بنیاد رکھی۔ ان کا شمار ''کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا'' کے بانی فعال اراکین میں ہوتا ہے۔ سجاد ظہیر کے ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' کی خوبی یہ ہے کہ اس میں انگلستان کی تہذیبی زندگی کا ہندوستان کی تہذیبی زندگی سے موازنہ کیا گیا ہے۔ اس ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' میں اس عہد کے ہندوستان اور انگلستان کی تہذیبی زندگی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ مارکسزم کے زیر اثر نوجوانوں میں انقلابی خیالات انگڑائیاں لے رہے تھے۔ ہندوستان میں آزادی کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ سیاسی، سماجی اور معاشرتی طور پر معاشرہ تبدیلی کے عمل سے گزر رہا تھا۔ ان سب عوامل کا عکس ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' میں ملتا ہے۔ ناولٹ سے اس عہد کے ہندوستان کی تہذیبی زندگی کے رجحانات، نفسیاتی عوامل اور حالات و کیفیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس ناولٹ میں مقامی تہذیبی تباہی کے اشارے بھی ملتے ہیں کہ کس طرح نوآبادکار مقامی لوگوں کی

تہذیبی شناخت کو مختلف طریقوں سے نہیں کرتے ہیں۔ ذہنوں پر قبضہ جماتا کی خاطر دیسی باشندوں کے کلچر، فن اور ادب وغیرہ کو گھٹیا قرار دیتے ہیں اور اس کے برخلاف نوآبادکاروں کی زبان اور کلچر کو اور ترقی یافتہ ثابت کرتے ہیں۔

کرشن چندر ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء کو ضلع گوجرانوالہ (موجودہ پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ آپ ناول نگاری کے علاوہ اردو کے نامور افسانہ نگار بھی تھے۔ ''شکست'' کرچن چندر کا معروف ناول ہے۔ کرشن چندر نے ''شکست'' کے

علاوہ اردو کے نامور افسانہ نگار بھی تھے۔ ''شکست'' کرشن چندر کا معروف ناول ہے۔ کرشن چندر نے ''شکست'' کے

علاوہ چالیس سے زائد ناول لکھے ہیں۔ جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔ ''جب کھیت جاگے''، ''طوفان کی کلیاں''، ''غدار''، ''مٹی کے صنم''، ''آسمان روشن ہے''، ''ایک گدھے کی سرگزشت''، ''ایک عورت ہزار دیوانے''، ''باون پتے''، ''سڑک واپس جاتی ہے اور ''برف کے پھول'' وغیرہ۔

''شکست'' اس عہد کی سیاسی و سماجی زندگی کا نمونہ ہے۔ اس ناول میں کشمیریوں کی غربت اور ان کے ساتھ ہونے والے استحصال کو واضح کیا گیا ہے۔ جنت نظیر کے باسیوں کی زندگی کی محرومیوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ فطرت کی گود میں تحریر کیا گیا یہ ناول جاگیرداری اور ذات پات کے تہذیبی شکنجے میں بسنے والے لوگوں کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس ناول میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح انسانی قدریں آہستہ آہستہ تبدیلی کی طرف اور مائل ہیں۔ ناول دور جدید کے انتشار ہے۔ چینی اور کرب کو اچھی طرح بیان کرتا ہے۔ قدروں کی تبدیلی کی وجہ سے نوجوانوں کے خیالات میں جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں ان کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

عصمت چغتائی ۲۱ اگست ۱۹۱۵ء کو ہندوستان کے شہر برایوں میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے ناول نگاری کے علاوہ افسانہ اور خاکہ نگاری میں بھی نام پیدا کیا۔ آپ ترقی پسند تحریک سے باضابطہ منسلک رہیں۔ ناول ''ٹیڑھی لکیر'' عصمت چغتائی کا معروف و مقبول ناول ہے۔ اس ناول کے علاوہ انھوں نے ''ضدی'' اور ''معصومہ'' کے نام سے بھی ناول لکھے۔ لیکن ''ٹیڑھی لکیر'' ان کی پہچان ہے۔ اس ناول میں متوسط مسلم گھرانوں کے تہذیبی بحران اور کشمکش کا نقشہ نظر آتا ہے۔ عصمت کا تہذیبی شعور متوسط مسلمان گھرانوں کے ماحول کی اندرونی عکاسی بخوبی کرتا ہے

۔ناول میں اس عہد کے متوسط مسلمان گھرانوں کے عمومی مسائل کو مدنظر رکھا گیا ہے۔سماج میں موجود خودغرضی، مفاد پرستی، معاشی تنگ دستی اور معاشرتی ناہمواریوں کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔ ہندوستان کے سیاسی حالات ومسائل کو بھی خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ ہندوستانیوں کی انگریزوں سے نفرت اور انگریزوں کا ہندوستانیوں سے تعصب کو بھی آشکار کیا گیا ہے۔اس ناول میں معاشرے کی تصویر ہی پیش نہیں کی گئی بلکہ معاشرتی رسموں پر بھی سخت تنقید کی گئی ہے۔

عزیز احمد ۱۱ نومبر ۱۹۱۴ء کو اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔آپ اردو کے ناول نگاری، افسانہ نگاری اور تنقید نگاری کے حوالے سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ان کی تحریروں میں ترقی پسندی کی چھاپ ہے۔ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' عزیز احمد نے لکھا ہے۔اس ناول کے علاوہ انہوں نے ''ہوس''، ''مرمر اور خون''، ''گریز''، ''آگ''، ''شبنم'' اور ''برے لوگ'' کے ناموں سے بھی ناول لکھے۔

ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں اس عہد کے حیدرآباد کی معاشرت اور تہذیب کو صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا گیا ہے۔اس میں متوسط اور اشرافیہ طبقے کی معاشرتی زندگی کا عکس دکھایا گیا ہے۔انگریزی تہذیب طبقہ امرا پر جو اثراتِ بدمرتب کرتی ہے اور اس کے نتیجے میں جو قباحتیں بیدار ہوتی ہیں۔دوسروں کی تہذیب اپنانے کے چکر میں جس طرح گھریلو زندگیاں تباہ ہوتی ہیں اس کی منظر کشی کی گئی ہے۔

حیدرآباد دکن کی تہذیبی زندگی زوال پذیر ہے۔اس کا احاطہ اس ناول میں کیا گیا ہے۔ناول کا موضوع مشرقی اور مغربی تہذیب کی آمیزش سے اثر پذیر امرا کا طبقہ ہے۔مغرب کی تقلید میں مسلمان گھرانوں میں رقص وسرور، بےنوشی کی محفلیں اور مخلوط جنسی اختلاط جیسی برائیاں پرورش پا رہی تھیں۔ان کا تذکرہ بھی اس ناول میں کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ جدیدیت کی وجہ سے مسلمان گھرانوں میں پائی جانے والی تہذیبی کشمکش اور بحران پر نظر ڈالی گئی ہے۔ زندگی کے بارے میں ٹھوس نظریہ حیات نہ ہونے کے باعث افراد کی زندگی بہتے ہوئے تنکوں کی مانند نظر آتی ہے۔ اسلم آزاد اس بارے میں یوں لکھتے ہیں:

''اس ناول میں حیدر آباد کے زوال آمادہ مشرقی کلچر کا بے حد اثر انگیز نقش تیار کیا گیا ہے۔ یہ کلچر مغربی تہذیب وتمدن سے مغلوب ومرعوب ہو چکا ہے۔لیکن اپنی شان وشوکت برقرار رکھنے کے لیے تکلیف دہ فریب میں مبتلا ہے۔اس کلچر کا اوپری ڈھانچہ بھی ٹوٹنے لگا ہے اور اس کی روح دم توڑ چکی ہے۔آزادی سے پہلے کے اس زوال آمادہ معاشرے کی مکمل اور بھر پور عکاسی یہاں موجود ہے۔''[۱۷]

ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں ہندوستانی روایات مذہبی رواداری ،نسرانی حیا، خاندانی وقار اور مشرقی تہذیب کی شکست وریخت کا المیہ خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

قراۃ العین حیدر ۲۰ جنوری ۱۹۲۷ء کو علی گڑھ میں اردو کے اولین افسانہ نگار سجاد حیدر یلدرم کے ہاں پیدا ہوئیں۔ان کی والدہ نذر سجاد بھی افسانہ نگار تھیں۔قراۃ العین حیدر نے ناول نگاری کے علاوہ افسانہ نگاری بھی کی ۔''آگ کا دریا'' ۱۹۵۹ء قراۃ العین حیدر کی شاہ کار ناول ہے۔جس میں مشترکہ تہذیب وثقافت کو تاریخی تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے تہذیبی وثقافتی ارتقاء کو اس کی تاریخ سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ کیونکہ یہاں کے تہذیبی ڈھانچے کو مختلف ادوار میں مختلف قوتوں نے متاثر کیا۔اس ناول میں ہندوستان کی ڈھائی ہزار سالہ تاریخی ،تہذیبی اور ثقافتی تاریخ کو سمیٹا گیا ہے۔

ہندوستان کی تہذیبی وثقافتی فضا عہد قدیم سے لے کر تقسیم ہند تک جن مراحل سے سے گزری ہے اور جس طرح مختلف تہذیبوں کے ملاپ سے ایک وحدت میں ڈھلتی گئی۔اس کی عکاسی اس ناول میں بخوبی کی گئی ہے۔ناول

''آگ کا دریا'' میں برصغیر کے تہذیبی وثقافتی تسلسل کی تلاش تاریخ کے ڈھائی ہزار سالہ سفر میں تلاش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

''آگ کا دریا'' میں ویدک درد، قدیم بدھ مت اور ہندوستانی تہذیب وتمدن اور مسلمانوں کی آمد کے بعد ہند مسلم تہذیب کی آمیزیش کو دکھایا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ کس طرح صوفی اور بھگتی تحریک نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو تہذیبی طور پر قریب کر دیا۔ ناول میں مذہبی رواداری کو عام دکھایا گیا ہے ۔مسلمان ہندو، صوفی ، بھگت ایک دوسرے کی عبارت گاہوں میں بلند تفریق و امتیاز آتے جاتے ہیں۔ دراوڑی تہذیب آریاؤں کی آمد، آریاؤں نے قدیم دراوڑی تہذیب کو توڑ کر اپنے فکری سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ۔مسلمانوں کی فتوحات اور بعد ازاں انگریزوں کے قبضے سے ہونے والی تبدیلیوں کا عکس ہمیں اس ناول سے ضرور ملتا ہے۔

قراۃ العین حیدر کو برصغیر کی مشترکہ تہذیب وروایات سے جذباتی وابستگی تھی۔ ماضی سے یہی لگاؤ ان کے دوسرے ناول ''آخری شب کے ہم سفر''، ''میرے بھی صنم خانے''، ''سفینہ غم دل'' اور ''کار جہاں دراز ہے'' میں تکرار کے ساتھ نظر آتا ہے۔ان کے ناولوں کے مطالعہ سے لگتا ہے کہ ماضی کی اقدار وروایات ان کے شعور اور لاشعور دونوں پر حاوی ہیں۔

عبداللہ حسین ۱۴ اگست ۱۹۳۱ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل نام خان محمد تھا۔ان کا آبائی علاقہ ضلع بنوں تھا۔ناول ''اداس نسلیں'' انھی کی تخلیق ہے۔ان کے دیگر ناولوں میں ''باگھ''، ''نادر الوگ'' اور ناولٹ میں ''نشیب''، ''قید'' اور ''رات'' شامل ہیں۔عبداللہ حسین فکری طور پر ترقی پسند ہیں۔''اداس نسلیں'' ناول میں تقسیم ہند سے قبل کے متحدہ پنجاب کے گاؤں کے کسانوں کی تہذیبی وثقافتی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔اس ناول کا موضوع پہلی جنگ عظیم سے لے کر تقسیم ہند تک پھیلا ہوا ہے۔اس ناول میں اس عہد کی شہری و دیہاتی زندگی کے نشیب وفراز ،عہد در عہد بدلتی ہوئی روایات جاگیرداری پس منظر میں بدلتی ہوئی تہذیبی اقدار، کسانوں مزدوروں کا استحصال

،جدوجہد آزادی کے لیے کی گئی کاوشیں، تقسیم ہند کے نتیجے میں ہونے والے فسادات اور تقسیم ہند کے بعد کی صورت حال کی عکاسی کی گئی ہے۔

پریم چند کے بعد عبداللہ حسین نے واضح طور پر ہندوستانی معاشرت میں کسانوں کے ساتھ روا رکھے گئے مظالم کی عکاسی کی ہے۔جنگوں اور سیاسی حالات کے تحت ہونے والی تباہ کاریوں، جاگیرداروں کا جبر، مہاجنوں کی لوٹ کھسوٹ اور قدرتی آفات کا کسانوں کی زندگی پر اثرات کا گہری نظر سے جائزہ لیا ہے۔ڈاکٹر خالد اشرف نے اس حوالے سے لکھا ہے:

> ''اداس نسلیں'' میں نہ صرف برصغیر کی تاریخ کے کئی ادوار کو تہہ بہ تہہ کھولا گیا ہے بلکہ یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ ہر لمحہ بدلتی ہوئی زندگی شہر اور دیہات کے باسیوں کی سائیکی پر کس طرح اپنے نقوش چھوڑ جاتی ہے۔''[۱۸]

یہ ناول کسی مخصوص طبقہ کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ ہر طبقہ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے خیالات کا احاطہ اس میں کیا گیا ہے۔اس حوالے سے اس ناول بجا طور پر ہندوستان کے جاگیردارانہ سماج کے زیر اثر سماجی ،معاشی اور سیاسی حالات کو تاریخ کہا جا سکتا ہے۔

مشہور افسانہ و ناول نگار جمیلہ ہاشمی ۱۷ نومبر ۱۹۲۹ء کو گوجرہ ضلع فیصل آباد میں پیدا ہوئیں۔ان کا آبادئی گاؤں امرتسر (موجودہ بھارت) میں تھا۔ جمیلہ ہاشمی کا مشہور ناول ''تلاش بہاراں'' تقسیم ہند سے قبل کی مشترکہ تہذیب کا عکاس ہے از تقسیم کے بعد اس تہذیب کے زوال کو پیش کرتا ہے۔انھوں نے ''تلاش بہاراں'' کے علاوہ دیگر ناول ''دشت سوس''، ''وداع بہار''، ''جوگ کی رات'' اور ناولٹ ''داغ فراق''، ''آتش رفتہ''، ''روہی'' اور ''چہرہ بہ چہرہ روبرو'' لکھے۔ناول ''تلاش بہاراں'' متحدہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیبی فضا اور ثقافتی اقدار و روایات کی عکاسی

کرتا ہے۔تہذیب وثقافت کی شکست وریخت اس ناول میں بخوبی دکھائی دیتی ہے۔طبقاتی تقسیم اوراس کے نتیجے میں ہونے والی زیادتیوں کاعکس بھی دکھایا گیا ہے۔

ناول میں واضح کیا گیا ہے کہ تہذیب کی چکا چوند میں گم افراد کا تانا بانا جب معاشرے سے کٹتا ہے۔تو وہ خشک پتوں کی طرح بکھر جاتے ہیں۔ناول میں تقسیم،مذہبی جنون اورفسادات کا انسانی ذہنوں پر اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس کے بعد علاوہ ہر طبقے کی عورتوں کے طرزِ معاشرت اوران کے مسائل کا تذکرہ بھی موجود ہے۔یہ ناول تقسیم ہند سے قبل کے ہندوستان کے سماجی اورتہذیبی رویوں اورمشترکہ تہذیب کا ہی عکاس نہیں بلکہ تقسیم کے بعد کے جدید تہذیبی انتشار کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔

شوکت صدیقی کے ناول'' خدا کی بستی'' ۱۹۵۸ء میں معاشرتی ،تہذیبی اور اقتصادی قدروں کا بحران نظر آتا ہے۔اس ناول میں جاگیردارانہ اورسرمایہ دارانہ نظام میں پسے ہوئے مجبور ومفہور محنت کش طبقے کی عکاسی کی گئی ہے۔یہ ناول نام نہاد پارساؤں کے منہ پر طمانچہ ہے۔جنھوں نے اس نوخیز مملکت پاکستان میں مذہب کے نام پر عیاری ومکاری کا بھیانک کھیل کھیلا۔غریب مزدوراور بے گھر بچوں کے مسائل کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا۔یہ بھی واضح کیا گیا کہ ملک تو حاصل ہوگیا لیکن ابھی تک معاشرتی ،تہذیبی ،اقتصادی اور سیاسی اقدار اور سمت کا تعین نہیں ہو سکا۔مجموعی طور پر یہ ناول معاشرے کا ایک المیہ ہے۔جس میں مختلف کرداروں کے ذریعے معاشرے میں موجود کالی بھیڑوں کا نقاب اتارنے کی کوشش کی گئی ہے اورغریب،نادار اور مظلوم بچوں،عورتوں اورمردوں کی تہذیبی زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔شوکت صدیقی کے دیگر ناولوں میں''جانگلسوس''،''چار دیواری''اور''کمیں گاہ'' شامل ہیں۔ان کے ناولوں کی فکری بنت طبقاتی کشمکش سے مربوط ہے۔

تہذیب سے متعلق مندرجہ بالا ناولوں کے جائزہ سے واضح ہوتا ہے کہ متحدہ ہندوستان اورتقسیم کے بعد ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں تہذیب وثقافت کی عکاسی بھرپور انداز میں کی ہے۔تقسیم ہند سے قبل اور بعد کے اکثر ناول نگار وہ ہیں جو بذات خود انسانی اقدار کی شکست وریخت اور تہذیبی وثقافتی انتشار سے براہ راست متاثر ہوئے

تھے۔ وہ تہذیب جو کبھی ان کے لیے اوڑھنا بچھونا ہوتی تھی۔ بعد ازاں اسی تہذیب کو انھوں نے منتشر ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس لیے بعض ادیب اس تقسیم کو ذہنی طور پر قبول نہ کر سکے اور اس کے اثرات ان کی تحریروں میں جا بجا نظر آتے ہیں۔

ایک عام انسان کی طرح ایک ناول نگار بھی کچھ مخصوص نظریات رکھتا ہے۔ جس کی جھلک اس کے فن پارے میں نظر آتی ہے۔ اعلیٰ ناول نگار زندگی کا گہرا مشاہدہ و مطالعہ کرتا ہے۔ اس لیے زندگی کے متعلق اس کے ہاں کوئی نہ کوئی نظریہ قائم ہو جاتا ہے۔ اس نظریے کی جھلک اس کی تحریر میں منکس ہونا ایک فطری عمل ہے۔ برصغیر کے منظر نامے پر اگر ہم نظر ڈالیں تو یہ ہر دور میں کے عمل سے گزرتا رہا۔ یہ خطے ہیرو کی حملہ آوروں مثلاً دراوڑ آریا، سکندر اعظم اور پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کی آماجگاہ بنا رہا۔ خصوصاً ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان کے معاشرے میں بے چینی کا عنصر بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ جس کے ردعمل میں مختلف قسم کی تحریکوں نے یہاں جنم لیا۔ ان تحریکات کے پس منظر میں کچھ نظریات کارفرما تھے۔ جہاں ہر طبقہ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے اپنے طریقہ کار کے مطابق ان تحریکوں میں اپنا حصہ ڈالا۔ وہاں اس دور میں لکھے گئے ادب میں بھی ان نظریات کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس دور میں لکھے گئے ناولوں میں یہ نظریات کہیں رومانیت کی صورت ظاہر ہوتے ہیں تو کہیں اشتراکیت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ کہیں رومانیت اور مذہب کا پرچار کرتے ہیں تو کہیں جمہوریت کی آڑ میں پناہ لیتے ہیں۔ کہیں مغربیت اور مادیت پر نکتہ چینی کرتے نظر آتے ہیں تو کہیں ترقی پسندی میں گوشہ عافیت تلاش کرتے ہیں۔ کہیں جدیدیت کی بات کرتے ہیں تو کہیں اصلاح پسندی کا بیڑا اٹھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اگر ہم اردو ناولوں کا سرسری جائزہ لیں تو ابتدا میں جو نظریہ کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ اخلاقیت، مذہبیت اور روحانیت اور نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کی مثال دی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ پریم چند کا ناول ''بیوہ'' بھی اس کی مثال ہے۔ اس طرح رومانیت پسندی کا نظریہ بھی واضح نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اشتراکی نظریات کی بدولت ترقی پسندی کا عنصر اردو ناولوں میں غالب نظر آتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے باعث افسانہ

ناول نگاری کی صورت میں خاصہ اضافہ ہوا۔قاضی عبدالغفار، پریم چند، سجاد ظہیر، کرشن چندر، عزیز احمد اور عصمت چغتائی وغیرہ کے ناولوں میں ترقی پسندی نظریات کی جھلک واضح دیکھی جاسکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سہیل بخاری، اردو ناول نگاری، اردو پریس، لاہور، بار اول، ۱۹۶۰ء، ص ۱۱

۲۔ علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ اور تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۷ء، ص ۲۸۲

۳۔ نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر، ناول کیا ہے؟ نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ، ۱۹۶۰ء، ص ۲۱

۴۔ سہیل بخاری، اردو ناول نگاری، اردو پریس، لاہور، بار اول، ۱۹۶۰ء، ص ۱۴

۵۔ ابن منظور، لسان العرب، ادب الحوزۃ، ۱۳۶۳ء، ص ۲۳

۶۔ گوپی چند نارنگ، اردو افسانہ روایت اور مسائل، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۵۲۵

۷۔ ملیحہ عدنان، سائرہ لقمان، پاکستانی معاشرہ۔۔۔تمدن و ثقافت، احسان سلیمان پبلشرز، لاہور، ص ۱۶۷

۸۔ ابو ریحان، البیرونی، سخاؤ، جلد اول، انجمن ترقی اردو، دہلی: ۱۹۴۱ء، ص، ۲۷

۹۔ سجاد، باقر رضوی، ادب، روایات اور فیض، مشمولہ، ساقی، کراچی، مارچ ۱۹۵۴ء، ص ۴۱

۱۰۔ احتشام حسین، سید، ادب اور سماج، قادری پریس، بمبئی، ۱۹۴۸ء، ص ۱۴۵

۱۱۔ انتظار حسین مرزا، ڈاکٹر، مرتبہ، دلی کی تہذیب، مضمون بعنوان، دلی والے، سید ضمیر حسن دہلوی، اکادمی، ۲۰۰۱ء، ص ۷۷

۱۲۔ صلاح الدین، ڈاکٹر، مرتبہ، مقدمہ، دلی والے، دہلی، اردو اکادمی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳

۱۳۔ ناز قادری، اردو ناول کا سفر، مکتبہ صدف، مہدی حسن روڈ، مظفر پور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۴

۱۴۔ صالحہ زریں، اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ (ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک)، سرسوتی پریس، الہ آباد، ۲۰۰۰ء، ص ۸

۱۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، نائس پرنٹنگ پریس، ۲۰۱۴ء، ص ۳۵

۱۶۔ یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول، نیشنل بک ڈپو، حیدر آباد، دسمبر ۱۹۷۳ء، ص ۳۳

۱۷۔ اسلم آزاد، ڈاکٹر، اردو ناول آزادی کے بعد، جلد اول، نکھار پریس، یوپی، ۱۹۸۱ء، ص ۵۲

۱۸۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، نصرت پبلیشرز حیدری مارکیٹ، لکھنؤ، ۱۹۹۵ء، ص ۳۷

باب سوم

ناول نگاری ایک مشکل فن ہے اس کے لیے حالات وواقعاتی کو ایک قطار میں پرونا ضروری ہوتا ہے اور ان حالات وواقعات کی روشنی میں بھی اخذ کرتا اور زیادہ مشکل فن ہے۔ناول نگاری کا فن ادب میں خوبصورت ترین فن ہے۔تحریر کو اتنا زیادہ دنیا ور ساتھ ساتھ اس طول میں مطلوبہ خوبصورتی پیدا کرنا بہت بڑی مہارت ہے۔کردار نگاری ، پلاٹ، زبان و بیان، منظر نگاری، مکالمہ نگاری وغیرہ جیسی تمام چیزوں کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ استعمال کرنا اور پھر اپنے ناول میں ان سب چیزوں کو برتنا واقعتاً ایک عظیم کام ہے۔بلند اقبال اس حوالے سے خاصے جانے پہنچاتے ہیں اور ان کے ہاں ناول نگاری کا فن اس قدر جدید ہے کہ انہوں نے ان تمام چیزوں کا بدرجہ اتم خاص خیال رکھا ہے۔

بلند اقبال کی ناول نگاری کو فنی حوالے سے دیکھا جائے تو بہت زیادہ خوبصورتی ملتی ہے اور اگر فکری حوالے سے دیکھا جائے تو بھی اس سے زیادہ خوبصورتی ملتی ہے۔ناول نگاری نہ صرف مشکل فن ہے بلکہ شاعری سے بہت زیادہ مختلف بھی ہے۔ناول نگار نے تمام باتیں نثر میں کرنی ہوئی ہیں۔پھر ان سے معانی ومطالب بھی نکالنے ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ انہی باتوں سے خوبصورتی بھی عیاں کرنی ہوتی ہے۔اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول یعنی نثر نگاری ایک تو شاعری سے زیادہ مشکل کام ہے اور دوسرا ناول نگاری میں اگر طبع آزمائی کی جائے تو وہ نثر کے اندر ایک خاص صنف ہے ناول میں اتنی طوالت اور پھر اس طوالت کو بحال رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔خاص طور پر اتنی ساری باتوں میں مخصوص رنگ اور مخصوص حسن پیدا کرتا تو بہت زیادہ مشکل ہوتا ہے۔بلند اقبال کے ناولوں کی یہی خوبصورتی ہے کہ انہوں نے اپنے ناولوں میں اس خوبصورتی کو ٹوٹنے نہیں دیا اور ہر حوالے سے ناول کے حسن کو بحال رکھا ہے۔جیسے منظر نگاری کا ایک جگہ پر بہت ہی زیادہ خوبصورت استعمال ان سے زیادہ کسی کے ہاں نہیں ملتا جیسے مثال ملاحظہ ہو:

'' مجھے لگا کمرے کی کثیف فضا میرے بے تکلف
جملوں کا بوجھ نہ اُٹھا سکی اور اچانک کچھ اس طرح سے

لطیف ہوئی جیسے کسی شیشے کے ٹوٹنے سے پہلے اس کی
کانچ میں چند سال آجائیں۔ جیسے سر در فیلی سا کے چلنے
سے چلنے بدن میں ہلکی سی خنکی کی لہر دوڑنے لگے یا جیسے
آنسوؤں سے قبل آنکھوں میں ہلکی سے نمی اتر آئے۔''[۱]

مندرجہ بالا لائنیں نہ صرف منظر نگاری کے حوالے سے بہت زیادہ خوبصورتی کی حامل ہیں بلکہ ان میں ایک طرح کا تشبیہ کا تعلق بھی نمایاں ہے۔ یہ تشبیہاتی تعلق بہت زیادہ خوبصورت ہے اور اس میں سب سے زیادہ خوبصورت بات یہ ہے کہ انہوں نے باتوں کو سیدھے سادھے مگر معنی خیز انداز میں تحریر کیا۔ بہر حال فنی حوالے سے ناول نگاری کا فن ان کے ہاں بہت زیادہ ہے اور اس حوالے سے وہ داد و تحسین کے لائق ہیں۔

ان کے علاوہ مکالمہ نگاری کا فن بھی ان کے ہاں بہت زیادہ جدید اور بہت ہی زیادہ اچھا ہے انہوں نے باتوں کو اس طور سے بیان کیا ہے کہ وہ جدید لگتی ہیں اور ان کا فن ان باتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مکالمہ نگاری میں کوئی پیچیدگی نظر نہیں آتی اور نہ ہی اس میں کوئی بڑی مشکل سائنس کو استعمال کیا گیا ہے۔ انہوں نے صرف سادہ انداز میں باتوں کو اچھے طریقے سے بیان کر دیا ہے جیسے:

''یہ تصویریں میں جلد ہی آپ کو لوٹا دوں گی، میرا وعدہ
ہے یہ کہہ کر میں نے تصویریں اپنے بیگ میں رکھ لیں مگر
اچانک مجھے احساس ہوا جیسے اس کی خاموشی میں کوئی
کرب چھپا ہوا ہے۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا میں نے ہاتھ
بڑھا کر اس کے دونوں کانپتے ہوئے ہاتھوں کو ہلکے سے
تھام لیا۔ یہ میرے پاس آپ کی امانت ہیں۔ مجھے معلوم
ہے ان تصاویر کی آ کی زندگی میں کس قدر اہمیت ہے۔

نہیں تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے ،اس نے بڑ بڑاتے
ہوئے کہا اور میں اس کے جملوں کی ذمہ معنویت کو پوری
طرح نہیں سمجھ سکی۔ میں نے اس کی آنکھوں کو دیکھا جو
چپ چاپ فرش کو تک رہی تھیں۔''۲

نثر میں یہ خوبصورتی بہت مشکل ہے اس کے علاوہ خاص طور پر اتنی طویل صنف میں اس حسن کو بحال رکھنا تو اور زیادہ خوبصورت ہے۔ بلند اقبال نے اپنی تحریر میں اس حسن کو اچھے طریقے سے بحال رکھا ہے اور قارئین اسی وجہ سے ان کے ایک ایک جملے سے لطف اٹھائے ہیں۔ انہوں نے ناول نگاری کے حوالے سے بہت سارے خوبصورت رویوں کو ظاہر کیا ہے اور خاص طور پر یہ رویے حقیقت کے روپ میں ہیں۔ جیسے زبان و بیان کی سادگی ان کے ناولوں میں بہت زیادہ حد تک پنہاں ہے۔ اتنی سادہ مگر با معنی زبان کا استعمال تحریر کو اور زیادہ خوبصورت بنا دیتا ہے۔ انہوں نے سادہ زبان میں بڑے بڑے با معنی جملے کہہ ڈالے ہیں جیسے:

''مجھے شروع میں ایک لمحے کے لیے یہ بھی خیال آیا جیسے
بوڑھی عورت کا یہ گھر زمین کے بجائے بہت سارے
ہوئے بادلوں پہ کھڑا ہے مگر پھر جلد ہی میری توجہ سامنے
سے آتی ہوئے قطار در قطار گاڑیوں پر مرکوز ہوتی چلی
گئی۔''۳

زبان کی سادگی ناول کے حسن کو اور زیادہ خوبصورت کر دیتی ہے۔ اگر آپ نثر میں خاص طور پر ناول میں چونکہ ناول زیادہ ضخیم ہوتا ہے۔ سادہ زبان کا استعمال کرتے ہیں تو قارئین نہ صرف اس کو پڑھتے ہیں بلکہ اس سے بہت زیادہ محفوظ ہوتے ہیں۔ یہی خوبصورتی ان کے ناولوں میں پنہاں ہے۔ انہوں نے ناولوں میں زبان و بیان کا خاص خیال رکھا ہے اور جملوں کو نہایت سادگی سے ترتیب دیا ہے۔ خاص طور پر جانے پہچانے لفظوں کا استعمال

قوسین، یعنی کا استعمال ان کی کو بہت زیادہ خوبصورت بنا دیتا ہے۔اس حوالے سے وہ ایک اچھے اور ممتاز ناول نگار کہلوائے جاسکتے ہیں۔

اس کے علاوہ وہ باتوں کو زیادہ طول دینے کے حق میں نہیں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر میں ہم باتوں کو ایک سے زیادہ جگہوں پر نہیں دیکھتے یعنی ایک ایک بات کو وہ بار بار دہرانے کے حق میں بالکل بھی نہیں ہیں۔یعنی ناول کی خوبصورتی بھی بحال رکھتے ہیں اور باتوں کو بھی ایک طرح سے ناپ تول کر ادا کرتے ہیں۔واختصار ہو تو ناول اور زیادہ خوبصورت بن جاتا ہے اور یہ صرف اس حالت میں ممکن ہے کہ آپ باتوں کو دہرانے سے پرہیز کریں اور یہ کام بلند اقبال کے بہتر اور اچھے طریقے سے سرانجام دیا ہے جیسے اس حوالے سے مثال ملاحظہ ہو:

> ''اُف! کس قدر ہولناک خواب تھا، میں نے خوف کی
> ایک جھرجھری لی۔کیا واقعی خواب تھا یا یہ کسی آئندہ پیش
> آنے والے واقعہ کا اشارہ تھا؟ میرے ڈوبتے دل میں
> اندیشے نے سر اٹھایا۔رونہہ ہلکی سی ایک آواز مجھ میں
> کہیں پیدا ہوئی اور پھر بنا خوف یا اکتاہٹ بنے ہی مجھ
> سے نکل بھی گئی۔میں نے ایک لمحے کے لیے پھر سے
> اپنی آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی مگر ایک انجانے سے
> خوف نے انھیں یک لخت کھول دیا۔''[۴]

زبان کی یہ سادگی ناول کے حسن میں اضافے کا سبب بنتی ہے اور ان کے ہاں بالکل اچھے انداز میں یہ خوبصورتی موجود ہے۔انہوں نے باتوں کو بالکل سادہ انداز میں کہہ ڈالا ہ اور ان باتوں سے بہت سارے راز بھی کھوے ہیں مگر سب کچھ سادگی اور سلاست سے کیا ہے۔

اس کے علاوہ ناول نگاری میں ایک چیز بہت زیادہ اہم ہے۔وہ ہے سادہ پن اور روانی اور سلاست روانی

اور سلاست ناول کے حسن کو بڑھاتی ہے اور اس میں وہ ایک طرح کا حسن بحال رکھتی ہے۔ جملوں میں روانی ہو اور انداز بیان بالکل سادہ ہو یہی چیز بلند اقبال کے ناولوں میں بہت اچھے طریقے سے دیکھی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر بلند اقبال ایک بہترین لکھاری کے حوالے سے سامنے آتے ہیں۔ ان کے ادب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اشیا کے درمیان ایک خاص ربط قائم کرتے ہیں اور مختلف حوالوں سے چیزوں کو جوڑتے ہیں۔ خاص طور پر ادب میں وہ ادبی تعلق کے حامل بہت سارے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ جو ان کے ادب کو اور بھی زیادہ خوبصورت بنا دیتا ہے جیسے ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

> ''کل آسمان صبح ہی سے ابر آلود ہو رہا تھا۔ بارش تھی کہ
> رہنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ایک بادل کا ٹکڑا اپنے
> دل کا بوجھ ہلکا نہ کرتا کہ دوسرا اپنی بھری ہوئی آنکھیں لے
> کر پہنچ جاتا۔ اس بوڑھی مغربی عورت سے تصاویر لے کر
> میں نے سوچا تھا کہ اب میں کہیں اور جانے کی بجائے
> سیدھا گھر ہی چلی جاؤں گی مگر نہ جانے کس خیال سے
> میں نے گاڑی شاہراہ فیصل سے نیشنل اسٹیڈیم کی طرف
> جانے والی سڑک پر موڑ لی تھی۔''۵

تحریر میں ربط اور جملوں میں بے ساختگی بلند اقبال کی فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ تحریر میں جیسے جیسے فکر پر حاوی رہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح وہ تحریر میں نظریاتی پختگی کا بھی یقین دلاتے ہیں اور ساتھ ساتھ فنی مہارت بھی بے پایاں نظر آتی ہے۔ بلند اقبال کی تحریروں میں بلد کی چاشنی موجود ہے اور وہ تحریروں کو اس قدر خوبصورت بنا دیتے ہیں کہ قارئین ان کی تحریروں کے نظریاتی، فکری اور فنی پہلوؤں کی داد دیتے رہتے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کی تحریر کا ایک فنی مزہ یہ بھی ہے کہ وہ بات کو جوں کا توں کرنے کے عادی ہیں اور عام روٹین یعنی معمولی کے رویوں کو بھی وہ تحریر

کا حصہ بنا دیتے ہیں جیسے مثال ملاحظہ ہو:

''اونہہ میری آنکھوں میں یہ دیکھ کر چمک سی لہرائی تو میر
اشبہ صحیح نکلا۔ میں نے عطیہ کی طرف معنی خیز نظروں سے
دیکھتے ہوئے کہا۔''[۶]

مندرجہ بالا لائنیں اسی کا بات منہ بولتا ثبوت ہیں کہ بلند اقبال تحریروں میں حسن پیدا کرنے کا فن اچھی طرح جانتے ہیں اور تحریر میں فنی پختگی کا جو وطیرہ وہ جانتے ہیں وہ شاید کوئی اور نہیں جانتا۔ ایک عام رواج ہے کہ مہمان جب باہر گیٹ تک چھوڑنے جاتے ہیں تو اس کی خدمت میں عام طور پر اضافہ سمجھا جاتا ہے ایسا ہی کچھ بلند اقبال نے اپنی تحریر میں بھی واضح کر دیا ہے کہ یہ ایک اچھی اخلاقی عادت ہے اس سے مہمان کو اچھا محسوس ہوتا ہے جیسے مندرجہ ذیل لائنیں بلند اقبال صاحب نے اس سماجی رویے کا منہ بولتا ثبوت ہیں:

''گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے میں نے بیک مرر میں
دیکھا، عطیہ گیٹ پر اس وقت تک کھڑی رہی جب تک
میری گاڑی اس کی گلی سے نکل کر واپس شاہراہ فیصل پر
نہیں آ گی۔''[۷]

بلند اقبال کی تحریریں ایسی بہت ساری اچھی عادات کے اسباق سے بھری پڑی ہیں جن سے وہ قارئین کی اخلاقی تربیت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس طرح پیشہ سے وابستگی اور پیشے کے اعتبار سے رویوں کی پختگی کو بھی بلند اقبال صاحب اپنی تحریروں کا حصہ بناتے ہیں۔ جیسے آرمی کے حوالے سے اور جوانوں کے حوالے سے وہ یوں لکھتے ہیں:

''کیا اس کا شاعرانہ دل بھی ایک دن فوجی کے سخت دل
میں بدل جائے گا؟ میں نے سوچا۔''[۸]

فکر کے ساتھ ساتھ بلند اقبال صاحب فن کو بھی اہمیت دیتے ہیں اور روزمرہ زندگی کے عام رویوں کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ حقیقی رویوں کی ترجمانی بھی ہو جاتی ہے اور ساتھ ساتھ تحریر میں خوبصورتی بھی پھر دیتے ہیں۔عورت کی فطرت کے متعلق چند جملے ملاحظہ ہوں:

''شاید کسی نے میرا غائبانہ تعارف کرایا ہو اور اب وہ مجھ
سے خاص طور پر ملنے کے لیے میرے آفس آیا ہے؟
میں نے سوچا .....مگر میری ایک عورت کی فطری
اضافے مجھے خود سے اس بات کرنے کے لیے روکے
رکھا اور میں اسے نظر انداز کرتے ہوئے اس کے سامنے
سے یوں گزر کہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی جیسے میں نے
اسے اپنی طرف دیکھنے کو محسوس تک بھی نہیں کیا ہو۔''[۹]

زبان کا استعمال بھی وہ عام کرتے ہیں ضرورت کے مطابق عام طور پر لوگوں میں مختلف زبانوں کو ملا کر بولنے کا جو رویہ عام ہے اس کو بھی جگہ جگہ واضح کرتے ہیں جیسے عام طور پر انگریزی زبان کو ہم بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں اپنی روزمرہ زبان میں تو یہ رویہ بھی بلند اقبال صاحب جوں کا توں بیان کرتے ہیں۔جیسے مثال ملاحظہ فرمائیں:

''ایکسکیوزمی کیا میں آپ سے بات کرسکتا ہوں۔''[۱۰]

حقیقت میں بلند اقبال صاحب ایسے رویوں پر ایک چوٹ سی لگاتے ہیں کہ اپنی زبان کا استعمال انسان کو خوبصورت بنا دیتا ہے اور کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ اپنی قومی زبان کو فروغ دیں کیونکہ اس میں ہماری عزت کے راز بنیادی ہیں۔اس کے علاوہ احتجاج اور دھرنوں کی وجہ سے عام لوگوں کو مریضوں کو اور معروف خاص طور پر ایمرجنسی کی صورت میں جو نقصان لوگوں کو اٹھانا پڑتا ہے۔اس کی بھی ایک جھلک ضرور دکھاتے ہیں۔جیسے مثال کے طور پر

مندرجہ ذیل پیراگراف اس رویے کا ترجمان ہے:

''آفس سے واپسی پر پھر وہی سڑکوں پر گاڑیوں کا رش میرا انتظار کر رہا تھا۔ کشمیر کاڑ کے لیے مزار قائد پر جلسے کے لیے سارے شہر سے ریلیاں جا رہی تھیں کہیں ٹریکٹر والے تو کہیں وکلا کہیں سیاسی جماعتوں کے کارکن تو کہیں مدرسوں کے طالب علم، ہر دوسری گاڑی میں سے لوگ پیشانیوں پر کشمیر بنے گا پاکستان کے بینر لپیٹے اور ہاتھوں میں جھنڈے لہراتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ نعرہ تکبیر اللہ اکبر کی گونج وقفے وقفے سے سنائی دے رہی تھی۔ اس بار چالیس منٹ کا گھر کا راستہ دو گھنٹے میں طے ہوا، سروس روڈ کام آ گئی اور میں نے جیسے تیسے گاڑی گلیوں میں سے نکال کر میٹرو پول سے نرسری تک کا سفر ایک گھنٹہ چالیس منٹ میں طے کر ہی لیا۔''[11]

اب یہ حقیقت ہے کہ احتجاج، دھرنے اور سڑک رکاوٹ کا اثر بہت سارے لوگوں پر پڑتا ہے۔ اسی سے ایک پہلو یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر آپ نے اپنا احتجاج کرنا ہے تو کم از کم مریضوں، عورتوں، بچوں اور امتحانات یہ جانے والے یا کسی بھی ایمرجنسی کی صورت حال کا تو کم از کم خیال کریں کہ وہ آپ کے اس احتجاج سے کتنا متاثر ہو رہے ہیں۔ یہ صورت حال بہت خطرناک ہوتی ہے اگر دوران احتجاج کسی مریض کی ایمرجنسی کی صورت حال میں جان چلی جائے تو سوچو آپ کو کتنا گناہ ملے گا یا کسی کا امتحان رہ جائے تو اس کا کیریئر تباہ ہو جائے گا اور آپ کو اس کا کتنا گناہ ملے گا۔ بہر حال یہ رویے ہماری روزمرہ زندگی میں عام ہیں اور بہت جگہوں پر ان کو دیکھا جا سکتا ہے۔

بلند اقبال کی تحریروں سے ایک طرح کا جنسی عنصر بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ لکھتے ہوئے اتنے محو ہو جاتے ہیں کہ کہیں کہیں وہ اخلاقی سرحدوں کو بھی عبور لیکن پھر بھی وہ باتیں ایسے تنگ دھڑنگ نہیں کرتے بلکہ پردے میں باتیں کرتے ہیں جیسے مثال ملاحظہ ہو:

''میں اس کی بانہوں میں سمٹتی چلی گئی اس کے گرم ہونٹ
جو میرے نرم ہونٹوں سے ملے تو مجھے لگا جیسے زندگی کا
امرت میرے انگ انگ میں اُترتا جا رہا ہے۔ چند ہی
لمحوں میں اس کی بانہیں میری کمر کو تھام کر مجھے جکڑنے
لگیں اور میں اس کے کشادہ سینے میں سمٹنے لگی اور پھر
اچانک اس کے ماتھے کے شریر بال میری خمار آلود
آنکھوں سے اٹھکیلیاں کرنے لگے۔ میں نے آنکھیں
جو مسکرا کر بند کی تو اس نے میرے چہرے، میری گردن
اور سینے کو والہانہ پیار کرنا شروع کر دیا اور پھر میں خود کو
اس کے حوالے کرتی چلی گئی۔ وہ مجھے پیار کرتا رہا اور میں
اس کے پیار میں سرشار ہوتی رہی۔ ایک پیاس تھی میری
، جو نہ بجھتی تھی اور ایک پیاس تھی اس کی جو بڑھتی ہی جاتی
تھی۔ کوئی لفظ کوئی خیال نہیں تھا ہمارے درمیان
، سوائے پیار کے کچھ اور احساس نہیں تھا ہمارے درمیان
باتیں پیار کی ہو رہی تھیں مگر لفظ نہیں تھے۔ اظہار محبت
کا ہو رہا تھا مگر آواز نہیں تھی ہمارے بدن چپ چاپ

ایک دوسرے میں کھوتے جا رہے تھے۔ وہ مجھ میں اترتا
جا رہا تھا۔ میں اس میں بہتی جا رہی تھی ایک عالم خود
سپردگی میں میں اس کی مضبوط بانہوں میں خود کو نڈھال
کرتی جا رہی تھی اور آہستہ آہستہ اپنے آپ سے بے گانہ
ہوتی جا رہی تھی۔''[۱۲]

اس طرح کی ربائی تحریر کا حصہ ہی اگر نہ ہو تو زیادہ بہتر ہے کیونکہ کسی بھی انسان کے جنسی جذبات سے کھیلنا بہت خطرناک اور غیر اخلاقی کام ہے۔ اس طرح کی باتیں نوجوان جذبوں کو خطرناک اور غیر اخلاقی طور پر چھیڑتی ہیں۔ جس سے بہت خطرناک نتائج سامنے آتے ہیں۔ اس طرح کی باتیں چاہے وہ لاکھ پردوں میں بھی کی جائیں تو پھر بھی انسان کو وحشی بنا دیتی ہیں۔ بلند اقبال کے ہاں کافی سارے افسانوں اور ان کی بہت ساری تحریروں میں یہ رویہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ کبھی کبھی وہ تہذیب کی حدیں پار کر جاتے ہیں اور اس طرح کے مواد کو اپنی تحریروں کا حصہ بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تحریروں سے ایک طرح کی وابستگی اور خاص طور پر جذباتی وابستگی کا عنصر بھی نمایاں نظر آتا ہے کہ لوگوں کو اس منحوس دنیا میں بھی جذبات سے کس حد تک لگاؤ ہوتا ہے جیسے خیال دیکھیں:

''میں نے جواب میں کہا جی جی ضرور ذوسیہ میں بس کچھ
ہی دیر میں آپ کے گھر پر ہوں گی۔ فاطمہ پلیز تصویریں
ضرور لے آنا، مجھے انھیں دیکھ کر سونے کی عادت ہے
، دیکھو کل رات بھی میری نیند نہ ہو سکی۔''[۱۳]

انسانوں کے ساتھ اس طرح کی وابستگی ایک عام سی بات ہے لیکن بلند اقبال صاحب نے اسے بھی تحریر کا حصہ ضرور بنایا ہے اور یہ رویہ ان کی طرف سے خوش آئین ہے۔ ''کھوئے ہوئے صفحات'' میں ایک بات یہ بھی دیکھی گئی ہے کہ بلند اقبال پینترے بدلتے رہتے ہیں۔ وہ تحریروں میں حسن اور چاشنی پیدا کرنے کے لیے پہلا بدل بدل

کر بات کرتے ہیں۔ یہ بات ان کی طرف سے عام طور پر یہ سامنے آتی ہے کہ وہ موضوع پر بات ضرور کرتے ہیں ۔لیکن موضوع کے حوالے سے سنجیدہ بالکل بھی نہیں ہیں۔اس ناول کے توسط سے کراچی کے آبادی کے حوالے سے کہ کس طرح کی آبادی وہاں رہتی ہے کا بھی تھوڑا بہت اندازہ بھی ہو رہی جاتا ہے جیسے:

''نہیں،نہیں ذوسیہ سے میری معلومات میں یہ کہ کر کچھ اور اضافہ کر دیا۔ایسا نہیں ہے فاطمہ کراچی میں تو ساری دنیا کے لوگ رہتے ہیں۔ ہندوستان کی تقسیم سے قبل تو قیر یہاں برٹشرز کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں امریکی، رشین اور یورپین بھی آباد تھے۔پھر آہستہ آہستہ یہ آبادی اپنے ممالک واپس چلی گئی مگر وہاں آج بھی کراچی کے مختلف علاقوں میں افغانی،ازبکستانی،کرغستانی،ایرانی،چینی،فلپائنی اور سری لنکن وغیرہ رہتے ہیں۔''[۱۴]

یہ تو تھی اس وقت کی کراچی کی حالت کہ اس کے اندر اتنے سارے ممالک سے تعلق رکھنے والے لوگ آباد تھے اور پھر اس سے کراچی شہر کے ماحول کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور اس کی خوبصورتی کا اندازہ بھی اچھی طرح سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کی وجہ سے کراچی میں کس قدر رنگینی ہوتی ہوگی۔اگر آج کے کراچی کو دیکھیں تو دل خون کے آنسو ضرور روتا ہے کہ اس کو برباد کر دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر بلند اقبال عام زندگی کے ادیبوں اور خاص طور پر لوگوں کے ادیبوں اور حسد کو بھی اپنی تحریروں کا حصہ بناتے ہیں۔لوگوں میں بعض حسد، جلن اور تعصب اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔حالانکہ ان لوگوں سے ان کا نہیں ہوتا۔ڈاکٹر بلند اقبال لوگوں کے اس رویے پر سخت تنقید کرتے ہیں اور اپنے

خیالات اس کے برعکس پیش کرتے ہیں۔ بہرحال وہ اس کو ضرور اپنی تحریروں میں بہتر انداز میں ڈھالتے ہیں ان کے اس حوالے سے یہ الفاظ دیکھیں:

> '' دیکھو، فاطمہ بعض لوگ دنیا میں اور لوگوں کے آئیڈیالوجیکل جھگڑوں کا ایندھن بننے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کا کسی کے معاملے میں کوئی لینا دینا نہیں ہوتا۔ وہ تو بس ایک سیدھی سادی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ جس میں ان کے دل میں کسی کے لیے کوئی نفرت یا غصہ نہیں ہوتا مگر بدقسمتی سے وہ معصوم بن کسی قصور کے اور لوگوں کی نفرت اور غصے کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ میرا شمار بھی انھیں لوگوں میں ہوتا ہے مجھے آج تک یہ بات پتہ نہ چلی کہ آخر مجھے زندگی میں کس بات کی سزا ملی تھی مگر ہاں مجھے اس بات کا پتہ چل گیا ہے کہ مجھے میری زندگی کے تجربات نے نفرت سے نفرت پیدا کرنے کا سبق دیا تھا اور پھر اس کے نتیجے میں بھی میر ا اور بھی نقصان ہو گیا۔''۱۵

.....لوگوں کی عام زندگی میں بہت زیادہ رواج ہے لوگ دوسروں کو دکھ پہنچانے ہیں اور اپنے رویوں اور اخلاقی کرداروں سے دوسروں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ یہ بات اکثر دیکھنے میں آتی ہے کہ لوگ لوگوں کی کامیابی بہت مشکل سے ہضم کرتے ہیں اکثر تو ہضم کرتے نہیں ہیں اور اگر کرتے بھی ہیں تو ان کو یہ کامیابی بہت مشکل سے ہضم ہوتی ہے۔ لوگوں کے اندر اس طرح کی اخلاقی گراوٹیں عام ہوتی ہیں۔ بلند اقبال اس سب کو

اپنی تحریروں میں شامل کرتے ہیں۔ یہ چیزیں ہمیں لوگوں سے اور سماج سے بہت دور لے جاتی ہیں اور ہم ان کا دکھ درد بالکل سمجھ نہیں سکتے۔ ایسے ہی جیسے ہم ساتھ والے کے ساتھ بیٹھے تو ہوتے ہیں مگر ان کا درد محسوس نہیں کر سکتے اور احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے ساتھ اور کوئی بیٹھا ہے۔ کچھ چیزیں انسان کو اس قدر اور مست کر دیتی ہیں کہ اسے احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس کے اردگرد بھی کوئی بیٹھا ہے۔ بلند اقبال نے اس رویے کو بھی تحریر کا حصہ بنایا ہے۔ جسے وہ ایک جگہ پر یوں اپنے کرداروں کے ذریعے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ:

> ''زوسیہ نے ایک گہرا سانس لیا اور کچھ لمحوں کے لیے
> چپ چاپ ہوا میں تکنے لگی جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش
> کر رہی ہو۔ میں موجود کہیں اس کے ساتھ ٹرین کے
> ڈبے میں کسی کونے میں پڑی ہوئی سفر کر رہی تھی اچانک
> ایک جھٹکے سے واپس نکل کر اس ڈرائنگ روم میں لوٹ
> آئی۔''[۱۶]

ہماری عام زندگی میں بھی یہ رویے عام طور پر دیکھے جاتے ہیں کہ ہم اکثر اپنے اردگرد کے لوگوں کو بھول جاتے ہیں اور ہمیں احساس نہیں ہوتا کہ ہمارے پاس نزدیک یا دور بھی کوئی رہتا ہے۔ ہم تمام جذبوں سے عاری ہو جاتے ہیں اور ہمیں لوگوں کی موجودگی کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں ہوتا۔ اس حوالے سے بلند صاحب نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ یا تو ہمیں احساس نہیں کہ ہمارے اردگرد کون ہے اور یا پھر ہم اس میں ذوق نہیں رکھتے ہماری دلچسپی صرف اور صرف ہمارے اپنے تک محدود ہے جو کہ انتہائی غلط بات ہے۔ اس سے یہ بھی مراد ہے کہ انسان کے اردگرد جو بھی ہو رہا ہے وہ اس کے وہم و گمان میں ضرور ہو۔ بلند اقبال صاحب کے اس افسانے کو ہم ایک سماجی افسانہ کہہ سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ اس میں اقبال صاحب نے نہ صرف سماجی اور معاشرتی احوال لکھے ہیں بلکہ بین الاقوامی

مسائل بھی اس کے اندر انہوں نے بیان کر ڈالے ہیں۔ جیسے کشمیر کے حوالے سے بھی انہوں نے بات کی ہے مثال کے طور پر انہوں نے اس بات میں بات کرتے ہوئے اپنے کرداروں کے ذریعے اس طرح پیش کروایا:

''ارے کشمیر پر یاد آیا سنا ہے بھارت وہاں خوب ظلم کر رہا ہے نہتے کشمیریوں پر؟ آپ کیا کہتی ہیں اس بارے میں؟ میں یہاں سیاست پر بات کرنے سے بھاگ رہی تھی وہیں اب پر باتیں پھر سے میرا پیچھا کرنے لگی تھیں۔ میں نے جان چھڑاتے ہوئے کہا، پتہ نہیں ڈاکٹر صاحب، تینوں مختلف موقف ہیں ہندوستانی حکومت اپنا پوائنٹ آف ویو رکھتی ہے اور پاکستانی حکومت اپنا مگر کشمیر کے عام آدمی کے موقف کو کبھی اہمیت دیتا ہے کیونکہ وہ مسائل سے زیادہ واقف ہے۔''[۱۷]

اور اس بارے میں وہ دونوں ممالک کی افواج کے سیاسی منظر نامے کو بھی بیان کرتے ہیں اور اس حوالے سے بیان کرتے ہیں اور اس حوالے سے کہتے ہیں:

''مشکل یہ ہے کہ دونوں طرف کی عسکری ایجنسیاں کشمیر میں اپنے اپنے سیاسی مقاصد پورے کرنے میں جٹی ہوئی ہیں۔ ایسے میں خبروں کا انبار لگا دیا گیا ہے تاکہ ہندوستانی اور پاکستانی یا کشمیر کی عوام بھی بس اس اخباری اطلاعات یا میڈیا کے دلدل میں پھنسے رہے اور اپنے

اپنے حکمرانوں کی نظروں سے ہی سیاسی منظر کو سمجھتے

رہے اور حقیقت سے دور رہے۔''۱۸

میرے خیال میں یہ ایک اٹل حقیقت ہے اور بلند اقبال صاحب کی بات حد درجہ سچی لگتی ہے کہ دونوں ممالک اپنے اپنے سیاسی مفادات حاصل کرنے کے لیے یہ کشمیر کا ڈرامہ رچا رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہاں کی غریب عوام کا خون نچوڑا جا رہا ہے اور ان کو تباہ و برباد کیا گیا ہے اور ابھی تک کہا جا رہا ہے اللہ کرے یہ مسئلہ جلد از جلد حل ہو۔ بلند اقبال صاحب جہاں اپنے اس افسانے میں سیاسی، سماجی، مذہبی، اخلاقی، تہذیبی منظر نامے بیان کرتے ہیں۔ وہاں کشمیر پر بات کرتے ہوئے اور بھی زیادہ اچھے ہیں اور کیوں نہ ہو یہ تو وقت کی بھی اہم ترین ضرورت ہے ۔کہ اس مسئلے کا فوری حل تلاش کیا جائے۔ عالمی طاقتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس مسئلے کے حل کے لیے اپنی کوششیں تیز سے تیز تر کر دیں تا کہ کشمیریوں کو خود ارادیت استعمال کرنے کی اجازت مل جائے اور وہ اپنی مرضی سے اپنے وطن میں آزادی کے ساتھ دی سکیں۔ بلند اقبال صاحب کے اندر کشمیریوں کے لیے محبت بے پناہ ہے اور اس بات کا منہ بولتا ثبوت یہ ہے کہ وہ اس کو اپنی تحریروں میں بھی شامل کرتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اس کو جلد از جلد حل ہونا چاہیے تا کہ کشمیری اپنی مرضی سے جی سکیں اور ہر طرح کی آزادی ان کو حاصل ہو سکے۔ اس سے ہٹ کر اور بھی بہت سارے ایسے سماجی، سیاسی، اخلاقی، مذہبی اور معاشرتی مسائل پر وہ جگہ جگہ اس ناول میں گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس ناول میں وہ کہیں کہیں پاکستان کی تقسیم کی بات بھی کر جاتے ہیں اور قارئین کو اس یاد سے اور بھی زیادہ دکھی کر دیتے ہیں اور ایک طرح کی پاکستان کی سیاست پر بھی تنقید کرتے ہیں اور چوٹ لگاتے ہیں، مشرقی اور مغربی پاکستان کی علیحدگی بہت زیادہ سنگین مسئلہ تھا اور آج تک وہ مسلمان جنہوں نے اس کی خاطر قربانیاں دیں وہ اس تقسیم کو نہیں بھول سکتے۔ بلند اقبال صاحب نے کافی ساری جگہوں پر اس کا تذکرہ کیا ہے جیسے مثال ملاحظہ ہو:

''ٹھیک کہہ رہی ہو عطیہ مگر یار ایک بات اکثر مجھے کھٹکتی

رہتی ہے کہ امی اچانک بنگلہ دیش سے پاکستان کیوں
چلی آئی تھیں جب کہ ان کی فیملی کے لوگ تو سب ہی
وہیں تھے اور میرے ابو کی بات بھی انھوں نے مجھے کبھی
نہیں بتائیں میں نے کتنی ہی بار پوچھا مگر وہ ہمیشہ بات
کو ادھر اُدھر کر دیتی تھیں۔''۱۹

اس سے ہٹ کر بھی متعدد مقامات پر انہوں نے اس تقسیم کے حوالے سے بہت ساری باتیں اس ناول میں کی ہیں ان کی یہ کوشش کامیاب کوشش ہے کہ وہ عام قارئین میں اس احتجاج کو متعارف کرواتے ہیں اور کروانا بھی چاہیے آخر کیوں مفاد پرست سیاستدانوں کے ٹولے نے اس پاکستان کو کتنا ہی زیادہ نقصان پہنچایا اور کس بے رحمی سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

ایک اور جگہ پر وہ کرداروں کے ذریعے بنگلہ دیش کا احوال یوں بھی بیان کر دیتے ہیں:

''سچ کہوں تو مجھے نہیں معلوم میرے ابو کون تھے؟ مجھے تو
انھوں نے کبھی ان کی تصویر تک نہیں دکھائی۔ جب بھی
پوچھا تو بس یہی کہہ دیا کہ ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور
ان کی ڈیتھ ہو گئی تھی اور پھر سب ضائع ہو گئیں مگر یار پھر
بھی یہ سب ڈائری میں لکھا ہوا جو کچھ مجھے ملا تو وہ
تصویریں وہ بھی ایک یورپین بچے کی۔ وہ سب کیا تھا؟
تم سوچ سکتی ہو کہ وہ جب ڈائری بنگلہ دیش سے سنبھال
کر لا سکتی ہیں تو کیا ابو کی تصویریں نہیں لا سکتی تھیں۔''۲۰

یہ ایک دل خراش واقعہ تھا کہ پاکستان کو دولخت کر دیا گیا اور اس میں سب سے زیادہ کردار کرپٹ، جاہل اور

حکمرانی کے نشے میں بدمست جاہل سیاستدانوں کا تھا کہ انہوں نے پیارے ملک کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور اسے سنبھال نہ سکے۔

بلند اقبال کی تحریر کی خوبصورتی یہ ہے کہ وہ بات کو ہر وقت ایک ہی موضوع پر نہیں رکھتے بلکہ تبدیل کرتے رہتے ہیں اور موقع اور مناسبت کے لحاظ سے وہ اس میں تبدیلی لاتے رہتے ہیں۔ خاص طور پر قارئین کی دلچسپی کے پیش نظر وہ ان کو ایسی دنیا میں گھماتے ہیں کہ قارئین ان کے دل دادہ رہتے ہیں۔ سماجی، سیاسی اور ملکی مسائل سے وہ محبت کی داستانوں پر چلے جاتے ہیں مندرجہ بالا لائنیں دیکھیں:

''گھر پہنچی تو رات خاصی ہو چکی تھی۔ صبح دفتر بھی جانا تھا
اس لیے سوچا فوراً جا کر ہو جاؤں گی مگر پھر یہ سوچ کر
لیپ ٹاپ کھول لیا کہ صرف ای میلز چیک کر لیتی
ہوں۔ واقعی امید کا محبت ناصر آباد ہوا تھا اور پھر جوں
جوں میں اسے پڑھتی گئی، میں اپنے بیڈ روم سے نکل کر
اس کی دنیا میں کھوتی چلی گئی اسد نے بہت ہی پیار سے
اپنا دل کھول رکھ دیا تھا۔ اس نے جوزیف بروس کی المیہ
نظم، اپنے دل کا حال اور کشمیر کے قصے سے سجا کر مجھے
محبت نامہ لکھا تھا۔''[۲۱]

محبت میں بے بسی سب سے بڑی ہے اور میری شق و محبوب اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں وہ اس بے بسی کو بھی بیان کرتے ہیں ایک اور مثال اس کی ملاحظہ فرمائیں:

''فاطمہ یہ تمہارا پیار ہے، ٹیگور کی نظمیں ہیں اور ہمارے
ہاتھوں کی گرمی ہے جس نے مجھے ابھی تک زندگی سے

باندھ رکھا ہے۔میرے دل کے حال سے پریشان مت
ہونا، میں چاہوں تو پل بھر میں سب کچھ چھوڑ کر تمہارے
پاس لوٹ کر آجاؤں مگر میں چاہتا ہوں کہ مجھے محبت کی
یعنی مل جائیں، میں زندگی سے گزر کر زندگی تک پہنچنا
چاہتا ہوں۔محض احساس اور شاعرانہ نغمے مجھے اس جبر
،درد اور خوف سے آگاہ نہ کر پائیں گے جب تک میں
امید و نا امیدی کی مشکل منزل سے گزر نہ جاؤں ۔
میں ایک سپاہی کی طرح واپس تمہارے پاس آنا چاہتا
ہوں اور میں بہت جلد تمہارے پاس لوٹ آؤں گا
۔فاطمہ بہت جلد کہ تم خود بھی میدان ہو جاؤ گی۔''[۲۲]

اس کے علاوہ ایک اور جگہ پر بھی وہ اس جات کو اس سے بے بسی اور اس مجبوری کو بیان کرتے ہیں اور یوں لکھتے ہیں:

'' مجھے جو کراچی میں نوکری مل جاتی تو میں یہاں کبھی
نہیں آتا یہ بات تمہیں تو مجھ سے زیادہ معلوم ہے۔ہاں
مجھے پتہ ہے کہ تمہیں جاب مل گئی ہے اور مجھے بھی شاید
وقت کہ میں تمہارے ساتھ رہ کر وہیں کچھ کر لینا مگر یار
میں کیا کروں؟ میں نے کب سوچا تھا کہ مجھے زندگی یوں
امتحان میں ڈالے گی میں اب سوچتا ہوں کہ یہ نیا ایک
لحاظ سے اچھا بھی ہے کہ جو میں نظریاتی باتیں کرتا رہتا

تھا اور تم سے اکثر بحثیں کرتا رہتا تھا انھیں سمجھنے کے لیے

قدرت نے مجھے یوں موقع دیا ہے۔''۲۳

محبت میں یہ بے بسی اور یہ رویہ عام سی بات ہے اس کے علاوہ کشمیر کے حالات پر بھی ایک نظر ڈالتے ہیں:

''یہ کشمیری پاکستانی اور بھارتی سیاست کی قیمت پکار ہے

ہیں؟ میں ایک نئی دنیا میں ہوں جو میری رومانوی دنیا

سے مختلف ڈراونی اور وحشت ناک ہے۔ یہ وہ دنیا ہے

جہاں نوجوان رو رو رہے ہیں۔ بچے اندھے ہو رہے

ہیں اور عورتوں کی آبرو ریزی ہو رہی ہے۔ میرا یہ عالم

ہے کہ میں ہر روز نئے بت تراشتا ہوں مگر میرے بت

زور ٹوٹ جاتے ہیں۔''۲۴

بلند اقبال نے اس ناول میں سماج اور رومانیت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ وہ عام قارئین کو دلچسپی میں رکھتے ہیں اور کسی بھی جگہ پر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ قاری ان کی تحریروں سے اکتاہٹ محسوس کر رہا ہے۔ بہر حال عشق و محبت کی داستانوں کے ساتھ ساتھ وہ باقی دنیا کے مسائل پر بھی پوری پوری خبر رکھنے والے انسان ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ بلند اقبال، کھوئے ہوئے صفحات، (ناول)، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۱ء، ص ۹

۲۔ ایضاً، ص ۱۲

۳۔ ایضاً، ص ۱۳

۴۔ ایضاً، ص ۱۵

۵۔ ایضاً، ص ۱۷

۶۔ ایضاً، ص ۲۱

۷۔ ایضاً، ص ۲۳

۸۔ ایضاً، ص ۲۴

۹۔ ایضاً، ص ۲۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۶

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۱

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۴

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۷

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۸

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۵۱

۱۸۔ ایضاً، ص ۵۱

۱۹۔ ایضاً، ص ۵۵

۲۰۔ ایضاً، ص ۵۵

۲۱۔ ایضاً، ص ۵۸

۲۲۔ ایضاً، ص ۶۰

۲۳۔ ایضاً،ص۶۱

۲۴۔ ایضاً،ص۶۱

محاکمہ

مقالہ نگار نے اپنی تحقیق میں ڈاکٹر بلند اقبال کے ناول ''کھوئے ہوئے صفحات'' کا انتخاب کیا اور اس کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ تحقیق سے یہ بات ثابت شدہ ہے کہ ڈاکٹر بلند اقبال ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں اور کینڈا میں مقیم ہی مقالہ نگار نے سوشل میڈیا کے توسط سے ان تک رسائی حاصل کی اور ان سے انٹرویو کے ذریعے معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ بلند اقبال ۷ اپریل ۱۹۶۶ء کو حیدر آباد سندھ کے ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جو نہ صرف علمی اور فکری حوالے سے بہترین تھا بلکہ معاشی حوالے سے بھی کافی مالدار تھا۔ ڈاکٹر بلند اقبال بیک وقت میڈیسن کے ڈاکٹر بھی ہیں۔ وہ افسانہ نگار بھی ہیں اور ٹی۔ وی پر لائیوشوز میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ انہوں نے ملکی اور غیر ملکی تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کی ہے۔ آپ نے میڈیکل میں گریجویشن ڈاؤ میڈیکل کالج سے کیا ہے اور اس کے بعد پوسٹ گریجویشن نیویارک میڈیکل کالج سے کیا۔ ان کو اریگن ہیلتھ سائنسز یونیورسٹی امریکا سے فیلوشپ بھی ملی ہے۔ آج کل ڈاکٹر بلند اقبال کینڈا میں میڈیکل اسپیشلسٹ کے طور پر کئی ہسپتالوں سے منسلک ہیں۔

ڈاکٹر بلند اقبال کے والد گرامی کا حمایت علی شاعر ہے جو خود بھی بہت اعلیٰ پایہ کے شاعر گزرے ہیں اور والدہ کا نام معراج نسیم ہے۔ وہ خود ایک اچھی افسانہ نگار تھیں۔ شاید ڈاکٹر بلند اقبال میں افسانہ نگاری کا فن انہی کے توسط سے آیا۔ پچھلے دس سالوں سے آپ کے افسانے پاکستان و ہندوستان کے اعلیٰ ترین ادیب جریدوں میں چھپ رہے ہیں۔ ''فرشتے کے آنسو''، ''میری اکیاون کہانیاں'' اور ''سارے ہی محبت نامے مرے'' آپ کی اب تک چھپ جانے والی کتب ہیں۔ ان کتابوں نے آپ کو ادب کی دنیا میں ایک وقار عطا کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے ناول ''ٹوٹی ہوئی دیوار اور ''کھوئے ہوئے صفحات'' کا نام قابل ذکر ہے۔ ڈاکٹر بلند اقبال نے ڈراموں کا ایک مجموعہ بھی ''یہیں سے اٹھے گا شور محشر'' کے نام سے لکھا ہے اور ایک مکالموں کا مجموعہ ''کبھی دامن یزداں چاک'' بھی ان کا تحریر شدہ ہے جو ابھی اشاعت کے مراحل میں ہیں۔ تقریباً ۱۰۰ سے زیادہ افسانوں اور مضامین کے تخلیق کرنے والے ڈاکٹر بلند اقبال ٹی۔ وی پروگرام بھی کرتے ہیں اور ان کی وجہ سے بھی آپ کو ادبی دنیا میں اچھا خاصا مقام و مرتبہ حاصل ہے۔

ان کا مشہور ٹی۔وی پروگرام ''پاسورڈ'' بہت معروف ومقبول ہے۔بلند اقبال کو ادبی دنیا میں نہ صرف عزت واحترام حاصل ہے۔بلکہ ادبی جریدوں میں آپ کے گوشے بھی چھپتے رہتے ہیں۔آپ کو ہندوستانی کلچر،اتر پردیش ،انڈیا اور بزم اردو ہیوسٹن کی طرف سے ایوارڈ بھی ملے ہیں۔بہر حال انہوں نے ادبی دنیا میں اور صحافتی دنیا میں کافی عزت کمائی ہے۔جو ان کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

مقالہ نگار نے باب دوم میں ناول نگاری کی تعریف اور اردو ادب میں ناول نگاری کے فن اور روایت پر گفتگو کی ہے۔تعریف میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ ناول انسان کی ساری زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ناول میں انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا جاتا ہے۔جس میں تہذیبی،سیاسی،مذہبی،معاشی،معاشرتی،سماجی،اقتصادی،علمی وغیرہ جیسے پہلوؤں کو زیادہ بہتر انداز میں بیان کیا جاسکتا ہے۔مقالہ نگار نے مختلف مفکرین اور محققین کے حوالہ جات سے اپنی تحقیق کو ثابت کیا ہے اور ان کے خیالات کی روشنی میں مقالے میں تمام باتیں شامل کی ہیں۔

اردو ادب میں ناول نگاری کی روایت بھی خاصی امیر ہے اور بہت سارے لوگوں نے اس فن میں اپنا جادو جگایا ہے ان لوگوں میں ڈپٹی نذیر احمد دہلوی،رتن ناتھ سرشار،مرزا ہادی رسوا،پریم چند،سجاد ظہیر،کرشن چندر،عصمت چغتائی،عزیز احمد،قراۃ العین حیدر،عبداللہ حسین،جملہ ہاشمی،شوکت صدیقی اور بانو قدسیہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں ۔ان مصنفین نے اردو ادب میں شاہکار ناول تخلیق کیے ہیں اور اردو ادب میں ان کا اچھا خاصا مقام ومرتبہ ہے۔اگر ان کے لکھے گئے ناولوں کی بات کی جائے تو ''قراۃ العروس''،''توبتہ النصوح''،''کرم دھم''،''کافی''،''رنگے سیاہ''،''طوفان بدتمیزی''،''سیر کہسار''،''جام سرشار''،''بچھڑی دہن''،''امراؤ جان ادا''،''افشائے راز''،''اختری بیگم''،''ذات شریف''،''شریف زادہ''،''گئودان''،''اسرارِ معابدہ''،''ہم فرماوہم ثواب''،''جلوہ ایثار''،''بیوہ''،''بازار حسن''،''گوشہ عافیت''،''نرملا''،''غبن''،''چوگانِ کہنی''،''پردہ مجاز''،''میدان عمل''،''منگل سوتر''،''لندن کی ایک رات''،''شکست''،''جب کھیت جاگے''،''طوفان کی کلیاں''،''عذار''،''مٹی کے صنم''،''آسمان روشن سے''،''ایک گدھے کی سرگزشت''،''ایک عورت ہزار دیوانے''،''باون پتے''،''وایک وائلن سمندر کے کنارے''،''درد کی

لہر''،''سڑک واپس جاتی ہے''،''برف کے پھول''،''ٹیڑھی لکیر''،''ضدی''،''معصومہ''،''ہوس''،''مرمر اور خون''،''گریز''،''آگ''،''شبنم''،''برے لوگ''،''ایسی بلندی ایسی پستی''،''آگ کا دریا''،''آخری شب کے ہم سفر''،''میرے بھی صنم خانے''،''سفینہ غم دل''،''کار جہاں دراز ہے''،''اُداس نسلیں''،''باگھ''،''نادار لوگ''،''نشیب''،''قید''،''رات''،''تلاش بہاراں''،''دشت سوس''،''وداغ بہار''،''جوگ کی رات''،''داغ فراق''،''آتش رفتہ''،''روہی''،''چہرہ بہ چہرہ روبرو''،''خدا کی بستی''،''جانگلوس''،''چار دیواری''،''کمین گاہ''اور''راجہ گدھ''وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔یہ ناول تاریخی، مذہبی، سیاسی، اقتصادی، معاشی، معاشرتی، سماجی اور علمی وغیرہ جیسے پہلوؤں پر بات کرتے ہیں۔مقالہ نگار نے دوسرے باب میں اردو ادب میں تخلیق کیے گئے شاہکار ناولوں کی روایت پر الجھے انداز میں بحث کی ہے اور کوشش کی ہے کہ ان ناولوں کے جتن اور موضوع پر بھی اچھی خاصی بحث کی جائے۔یہ بات ثابت شدہ ہے کہ اردو ادب میں تخلیق کئے گئے ناول ادب کا شاہکار ہیں اور بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

باب سوئم میں مقالہ نگار نے ڈاکٹر بلند اقبال کے ناول ''کھوئے ہوئے صفحات'' کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔مقالہ نگار نے اس ناول کے ایک ایک صفحے کا مطالعہ کیا ہے اور اس کا خلاصہ تحقیق کی روشنی میں اپنے مقالہ کا حصہ بنایا ہے۔ڈاکٹر بلند اقبال نے اس ناول میں انسانی زندگی کے تہذیبی، معاشی، معاشرتی، اقتصادی، نفسیاتی، سماجی اور مذہبی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔کرداروں کے ذریعے معاشرے کے ان تمام پہلوؤں سے پردہ چاک کیا ہے۔خاص طور پر پاکستانی معاشرے کے حالات کا میاب زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ڈاکٹر بلند اقبال روایات کو جاننے والے آدمی نہیں ہیں اور روایات سے باغی ہیں۔یہ بات ان کے ناول ''کھوئے ہوئے صفحات'' میں جوں کی توں نظر آتی ہے کہ وہ روایات سے باغی انسان ہیں اور علمی زندگی کو زیادہ اچھے طریقے سے دیکھتے ہیں۔

مختلف کرداروں کے ذریعے وہ پاکستانی معاشرے میں موجود ہر اس برائی پر تنقید کرتے ہیں۔جس وجہ سے یہ معاشرہ تباہ و برباد ہوا اور جس وجہ سے آج پاکستانی معاشر ہی تباہی و بربادی کی طرف رواں دواں ہے۔ناول ''کھوئے ہوئے صفحات'' سے ایک بات یہ بھی سامنے آئی ہے کہ ڈاکٹر بلند اقبال نے اس معاشرے کی سب سے

بڑی برائیوں غیر اخلاقی، غیر انسانی رویش وغیرہ پر بھی بات کی ہے۔ خاص طور پر کراچی جیسے خوبصورت ترین شہر کی موجودہ حالت کس وجہ سے بنی اور اسی طرح اس ناول میں ڈاکٹر بلند اقبال نے بنگالیوں کی ہجرت اور تقسیم پاکستان یعنی ۱۹۷۱ء کے واقعات کی بھی تفصیلاً بحث شامل کی ہے۔

''کھوئے ہوئے صفحات'' انسانی رویوں پر کھل کر بحث کی گئی ہے اور کہ کس طرح انسان دوسرے انسانوں کے لیے تباہ و بربادی کا موجب بنتے ہیں۔ بہر حال یہ ناول ڈاکٹر بلند اقبال کی کمال فہم و فراست اور ادب سے وابستگی کا منہ بولتا ثبوت ہے اور اردو ادب میں ایک پیش قیمت اضافہ ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ

☆ بلند اقبال، کھوئے ہوئے صفحات، (ناول)، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۱ء

ثانوی ماخذ

☆ ابن منظور، لسان العرب، ادب الحوزۃ، ۱۳۶۳ء

☆ ابوریحان، البیرونی، سخاؤ، جلد اول، انجمن ترقی اردو، دہلی: ۱۹۴۱ء

☆ احتشام حسین، سید، ادب اور سماج، قادری پریس، بمبئی، ۱۹۴۸ء

☆ اسلم آزاد، ڈاکٹر، اردو ناول آزادی کے بعد، جلد اول، نکھار پریس، یوپی، ۱۹۸۱ء

☆ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، نصرت پبلیشرز حیدری مارکیٹ، لکھنؤ، ۱۹۹۵ء

☆ سجاد، باقر رضوی، ادب، روایات اور فیض، مشمولہ، ساقی، کراچی، مارچ ۱۹۵۴ء

☆ سہیل بخاری، اردو ناول نگاری، اردو پریس، لاہور، بار اول، ۱۹۶۰ء

☆ صلاح الدین، ڈاکٹر، مرتبہ، مقدمہ، دلی والے، دہلی، اردو اکادمی، ۲۰۰۱ء

☆ صالحہ زریں، اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ (ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک)، سرسوتی پریس، الہ آباد، ۲۰۰۰ء

☆ علی عباس حسینی، ناول کی تاریخ اور تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۷ء

☆ گوپی چند نارنگ، اردو افسانہ روایت اور مسائل، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

☆ نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر، ناول کیا ہے؟ نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ، ۱۹۶۰ء

☆ ناز قادری، اردو ناول کا سفر، مکتبہ صدف، مہدی حسن روڈ، مظفر پور، ۲۰۰۱ء

☆ یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول، نیشنل بک ڈپو، حیدر آباد، دسمبر ۱۹۷۳ء